
سویرا

سویرا

افسانے

ظہور الحسن ڈار

عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار لاہور

قیمت ۲ روپے

تعداد ایک ہزار

پہلا اڈیشن

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر
عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار لاہور سے شائع کیا۔

مصنف :- ظہور الحسن ڈار

پیدائش :- ۱۷ اپریل ۱۹۲۳ء

موجودہ پتہ :- حویلی اللہ بخش
حسام الدین روڈ امرتسر

فہرس

ہندوستان کے باغی شاعر

قاضی نذرالاسلام

کے نام

"صدہا سال گذر گئے۔
اور لیلیٔ شب اب تک مشرق کی دہلیز پر آنکھیں لگائے بیٹھی ہوئی ہے۔
ندامت کے رنگ میں شرابور ہو کر قسمت کا ستارہ ڈوب گیا،
اور ہم ہیں کہ اب تک اس خفت کا داغ نہ دھو سکے۔
ہمارا خون پی پی کر موت زندہ ہے۔
اور اس طریقے سے ہم اپنے اجداد کا قرض ادا کر رہے ہیں۔
بھارت ماتا! تجھے معلوم ہے کہ صبح صادق کا منہ ہم کب دیکھیں گے؟
جس ہاری ہوئی بازی کی شرم کے مارے شام وطن کا چراغ بجھ گیا۔
لاریب کہ ہم صدیوں سے اس کی لو کو اکسا رہے ہیں۔
جب ہماری جبیں کے لہو کا ٹیکا شفق کو لالہ گوں بناتا ہے تو زمانہ اسے دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے کہ اے لو وہ صبح ہو چلی۔
لیکن اُمید کی جو نوید ہم خونِ جگر سے لکھتے ہیں اسے قسمت کے جابر ہاتھ فوراً مٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ شام کبھی نہ کٹے گی؟
ایک نسل کی سیاہ کاریوں کا بار اور کتنی نسلیں اٹھاتی رہیں گی؟
ان گنت ہاتھ بے شمار دلوں کے ٹکڑے پوجا میں چڑھانے لائے ہیں۔
مادرِ وطن، جاگ جا اور اس نذر کو قبول کر۔
اگر ہمارے گناہوں کی کوئی تلافی نہیں اگر ہماری شام کی کوئی صبح نہیں تو للہ اُٹھ اور ہم سب کو فنا کر دے۔
ہمیں درندگی کی زندگی اور بے حیائی کی موت گوارا نہیں۔
مرنا ہے تو ہم دیوتاؤں کی طرح کیوں نہ مریں۔۔۔۔۔

نذر الاسلام

تعارف

ڈاکٹر سیّد اختر حسین رائے پوری ڈی۔لٹ (پیرس)

اردو میں مختصر افسانہ کو ایسے زمانہ میں فروغ حاصل ہوا جب سماج کی پرانی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں اور زندگی کو کسی نئے نظام کا اسلوب میسر نہ ہوا تھا۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے لگ بھگ منشی پریم چند نے اس صنفِ ادب کا سنگھار نکھار شروع کیا۔ اُس جنگ اور اس جنگ کے بیچ کا زمانہ کس قدر پُرآشوب تھا۔ ہر طرف انقلاب و انتشار، ہیجان و ہنگامے کی گونج گرج۔ جب ماحول کی یہ کیفیت ہو تو کیسے ممکن تھا کہ افسانہ نویس کی طبیعت میں سکون و قرار ہو۔ یوں بھی ہماری نثر کی عمر چھوٹی سی۔ روایات خام۔ طرفہ یہ کہ ناشروں نے ادیبوں کی بجائے ناظروں کا مُنہ تاکا اور ان کی بیت مذاقی کو برچایا اور ادیب غریب سے یہ توقع کی کہ وہ ہوا کھا کر زندہ رہے کیونکہ خدا یا عورت کے سوا لوگوں کو اور معاملات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ شاعروں کے لئے پھر بھی آسانی تھی کہ مُشاعروں نے اُن کی گذر بسر کا تھوڑا بہت انتظام کر دیا تھا۔ لیکن افسانہ نگار کیا کرتا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ بھی تنبواڑی کی دوکان پر بیٹھ کر افسانہ گوئی شروع

کر دیتا۔ لیکن یہ فن بھی ایک دوسرے فن کی طرح "ویاؤ" سے کم نہیں
نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ افسانہ نگار روٹیوں کے لئے کچھ اور کرے اور
فرصت کے وقت کچھ اور کر لیا کرے۔ ان ساری دشواریوں کے
باوجود اس قلیل مدت میں افسانہ نگاری نے ہماری زبان میں جو ترقی کی
وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ اگر اس میں خامیاں ہیں تو وجہ اس کے
سوا کچھ نہیں کہ ماحول کا تلوّن اور وقت کی تنگی احساس و تجربہ میں وہ
گہرائی پیدا نہیں ہونے دیتی جس کے بغیر عظمت و وسعت ناممکن ہے۔

اس زمانہ میں اور اس ماحول میں افسانہ نگاروں کی پرورش ہو رہی
ہے اور ان میں سے اکثر کی عمر اتنی ہی مختصر ہے جتنی اردو میں مختصر افسانہ
نگاری کی عمر۔ ان میں تخلیقی جوہر کی کمی نہیں لیکن اچھے سے اچھا بیج بھی
ہوا روشنی اور پانی کا محتاج ہوتا ہے۔

ذہنی اعتبار سے یہ مارکس اور فرائڈ کا دور ہے۔ خارجی دنیا کا
جس قدر واضح تجزیہ مارکس نے کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ نفسِ انسانی
کے تجزیہ میں فرائڈ نے بڑا کمال دکھایا مگر میری نظر میں اس کا نظریہ نفس
کی تمام گتھیوں کو نہیں سلجھاتا۔ زندگی ایسی سیدھی سادھی نہیں کہ اسے
کسی فارمولا کی بوتل میں اتارا جا سکے۔ اس پس منظر میں اپنی افسانہ نگاری
کا مطالعہ ہونا چاہئے۔ انہیں نوجوان افسانہ نگاروں میں ایک ظہور الحسن ڈار
ہیں۔ وہ ان خوش نصیبوں میں نہیں جن کی سرپرستی کے لئے رسائل و جرائد
ڈھول منجیرہ لئے تیار ہوں۔ جن کے ہر لفظ پر ہر طرف سے مرحبا و احسنت کا

شور اُٹھے۔ خدا رکھے ادب کے میدان میں ابھی اُترے ہیں لیکن اس کی دشواریوں سے واقف اور اگر ہمارے کارواں میں وہ بھی شریک ہیں تو قصور صرف اُس روحانی بیقراری کا ہے جو انہیں کچھ کرنے اور کچھ کہنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

ان کا فن اپنی پہلی منزل پر ہے۔ ان کے افسانوں میں ابھار نہیں۔ ان کے کرداروں میں شخصیت نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جن لوگوں کو دیکھا۔ اور حق یہ ہے کہ غور سے دیکھا۔ اُن کی زندگی بے رنگ ہے اور وہ سب زندہ درگور ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کیوں پیدا ہوئے اور کیوں زندہ ہیں۔ ان کے لئے زندگی اور موت محض اتفاق ہے۔ حسنِ اتفاق بھی نہیں!۔ افسانہ نگار انہیں غم و غصہ سے دیکھتا ہے۔ دِل کی تلخی قلم میں جھلک آتی ہے۔ وہ انہیں جھنجھوڑتا ہے۔ لیکن وہ بیدار نہیں ہوتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کس طرح جگائے لیکن یہ نکتہ امید افزا ہے کہ وہ مایوس نہیں ہوتا۔ شمال میں جگمگاتا ہوا سُرخ ستارہ اسے راہ دکھاتا ہے اور وہ اس راہ پر چلنے کے لئے منصوبہ باندھنے لگتا ہے۔

یہاں افسانہ نگار ہمیں چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہی صراط مستقیم ہے اور یہ جاندار جو زندگی کے رتھ میں جُتے ہوئے ہیں دیر سویر اسی طرف روانہ ہوں گے —— اُن کے قلم میں روانی ہے۔ اور اگر کہیں خیال کا کوئی روڑا اسے روکتا ہے تو اُن کا خلوص اس مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔

ظہور الحسن ڈار کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے فن پر ثابت قدم رہیں اور یاد رکھیں کہ نقاد وہ چور ہے جو دروازے پہ کان لگائے فن کار کی سرگوشیوں کو سن رہا ہے۔ اس کی سُنی ان سُنی پر دھیان نہ دیں ناظر کی واہ واہ کی تمنا نہ کریں اور نہ تنزّل پسندوں کی لعن طعن کی پرواکریں سچے فن کار کا صلہ ابدی بیقراری کے سوا کچھ نہیں لیکن یہ ضرور یاد رکھیں کہ مظلوم انسانیت ہمارے غم و غصہ کی نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق ہے۔

مستقبل انہیں جاہ و ثروت نہ دیگا۔ شہرت بھی انہیں مہنگے داموں ملے گی لیکن وہ یقیناً ان لوگوں میں سے ہیں جو تاریکی میں مشعل جلا کر زندگی کے مقصد کو پا جاتے ہیں۔ دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں اور خود کو اُجاگر کرتے ہیں ﷺ

اختر حسین رائے پوری

اکتوبر ۲۴ء

زینہ

وہ اپنے تاریک کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو تازہ اور خوشگوار ہوا نے اس کے چہرے اور جسم کو چھُوا۔ بارش ہو چکنے کی وجہ سے فرش کی سُرخ اینٹیں دُھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ننھی اور سرسبز بیلیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں اور اِن کے درمیان نیلے اور سفید پھُول کانپ رہے تھے۔ آسمان ایک وسیع ریگستان کی طرح پھیلا ہُوا تھا اور فضا میں کپکپاتے ہوئے تارے موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہیں کہیں سفید بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے سکُون کے ساتھ سو رہے تھے۔ اور اِن کے درمیان چاند زرد اور نیلی روشنی سے گھرا ہُوا افسردہ اور اُداس معلُوم ہو رہا تھا۔ وہ آہستگی سے نرم نرم قدم رکھتا ہُوا صحن کی اختتامی دیوار کے

قریب پہنچا اور چھوٹے چھوٹے گملوں میں اُگے ہوئے سُرخ پھولوں پر جھک گیا اس کے ہاتھوں نے پتوں اور پھولوں کی ملاحت محسُوس کی۔ خرگوش کے بالوں کی طرح نرم اور ملائم دھاریاں اس کی اُنگلیوں میں پھیلنے لگیں۔ ہوا میں ایک لازوال اور لطیف مہک پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بڑی احتیاط سے اس نشہ آور خوشبو کو اپنی سانس میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہلکی خنک ہوا اس کے کپڑوں سے چھُو کر گزُر رہی تھی۔ اور ایک میٹھی اور دائمی لذت اس کے جسم کے گوشے گوشے میں رُوح کے کونے کونے میں پیوست ہوتی جا رہی تھی وہ کچھ دیر تک اپنے آپ کو بالکل بھُولا ہوُا اسی طرح پھولوں پہ جھُکا رہا۔ پھر آہستہ سے سیدھا ہوا اور فرش پر ٹہلنے لگا۔ کمرے کی تاریکی کی بہ نسبت وہ صحن کی روشنی اور ہوا کی تازگی سے بہت متأثر تھا۔ اندھیرے سے یک لخت روشنی میں آنے سے جیسے اس کی رُوح میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کے بے چین اور مضطرب دل کو اُجال دیا تھا تھوڑی دیر پہلے وہ جس سوچ کی تلخی سے گھبرا کر باہر کو بھاگا تھا۔ وہ اب کمزور ہو چکی تھی اور وہ اطمینان کے ساتھ پھر سے اس پہ غور کر سکتا تھا۔ سوچ اس کی زندگی کا جزو بن چکی تھی وہ اگر محض خواب ہی دیکھتا تو شاید اس کی زندگی میں اتنی بے چینی اور اُلجھن نہ ہوتی، مگر سوچنے کی عادت نے اس کا اطمینان چھین لیا تھا۔ سوچنے میں وہ عجیب قسم کی قلابازیاں کھایا کرتا تھا۔ کئی بار یُوں ہوتا۔ کہ جب وہ کسی مسئلے کو قریب قریب سُلجھا چکتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وُہ سُلجھا نہیں۔ بلکہ محض اس کی

شکل تبدیل ہوگئی ہے وہ آنکھیں پھیلا کر اس نئی شکل کی طرف دیکھتا۔ اور اپنی ذہنی کمزوری پر مسکرا کر پھر سوچنا شروع کر دیتا۔ اکثر جب یہ سوچ فضول اور بے کار ثابت ہوتی تو وہ جھلا اُٹھتا اور تلخی سے اس کا سارا جسم کھولنے لگتا۔ اندھیرے میں سوچنا اسے زیادہ پسند تھا کیونکہ تاریکی میں اس کی سوچ ایک ٹھوس شکل اختیار کر لیتی تھی اُس کے تمام خیالات اکٹھے ہو کر ایک خشک چشمے کے گرد گھومنے لگتے تھے جس کی نم آلود سطح پر سینکڑوں گلے سڑے پتے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی سڑاند سے تعفن پیدا ہو چکا تھا۔ اسے یہ منظر بڑا ناگوار گزرتا تھا۔ وہ چاہتا کہ کسی طرح یک لخت چشمے میں ہلچل ہو اور پانی اُبھر آئے اور اس کے بہاؤ میں سطح کا کوڑا کرکٹ اور تعفن کسی نامعلوم سمت میں گم ہو جائے وہ اپنے آپ کو اسی چشمے میں جذب دیکھتا اور سمجھتا تھا کہ اس وقت جتنی برائیاں اس کے اور دوسرے لوگوں کے اندر موجود ہیں وہ اسی جماد اور سکون کی وجہ سے ہیں۔ اسے یقین تھا۔ کہ جس وقت بھی عمل ہوا زندگی کا چشمہ تیزی سے پھوٹ بہے گا۔ اور ان تمام برائیوں کو سمیٹ کر کسی تاریک جگہ پھینک دیگا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کی زندگی پر ایک غیر مرئی جمود طاری ہو چکا ہے جو خاموشی سے اس کی عملی قوتوں کو فنا کر رہا ہے۔ وہ اس سے سخت متنفر تھا۔ اسے معلوم تھا۔ کہ یہ جمود آخر کار اسے بیجان کر دے گا۔ اس لئے وہ اس سے پرے ہٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور سوچ میں رہتا تھا۔ کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جس سے اس کی انسانیت

موت کے گھاٹ اُترنے سے بچ جائے۔ یہ فکر اس کے دِل میں دھکتے ہوئے انگارے کی طرح اُتر رہا تھا۔ وہ اپنے اور اپنے جیسے لاکھوں انسانوں کیلئے ایک ایسے شعلے کی تلاش میں تھا۔ جس کی روشنی میں زندہ رہنے کا مصرف معلوم ہو سکے ——— خنک ہوا کے جھونکوں اور ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلنے سے اسے ایک غیر محسوس اور مٹھاس بھری جھرجھری آئی۔ وہ کچھ دیر یُونہی ٹہلتا رہا پھر کمرے میں لوٹا اور جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔ گلی میں پہنچ کر اس نے سگرٹ سلگایا اور بازار میں ہو لیا۔ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور عمارتوں کے لمبے سائے زمین پر آسودگی سے لیٹے ہوئے تھے دکانوں میں بجلی اور سُرخ بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ اور کسی کسی جگہ شعلے بھی دھک رہے تھے۔ لوگ بہت کم تعداد میں آجا رہے تھے مگر انہیں دیکھ کر اس کے دِل میں بیزاری سی پیدا ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہوا اور چاندنی کی سہانی کرنوں کی ملاوٹ سے جو مسرت اس کے اندر عود کر آئی تھی وہ ان کے سنگین چہروں کے مشاہدے سے ہٹ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ احساس اور جذبات کھو چکے ہیں۔ اور خالی پیٹ لئے ایک ہی مقصد کی خاطر اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں اس نے ایک آدمی کو جو سر جھکائے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بڑھ کر پوچھنا چاہا کہ تم کیوں زندہ ہو۔ مگر وہ رُک گیا۔ آخری وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ جیسے ہر طرف پتھر کے بڑے بڑے بُت تراش کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اور وہ ان کے

ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی ہیں۔ اور وہ خیال کے دھندلکے میں اپنے آپ کو ایک ایسی چوٹی پر کھڑا پا رہا تھا۔ جہاں سے اسے اُفق کی کالی اور نیلی لکیر تک پھیلی ہوئی زمین پر انسانوں کے گروہ سر جھکائے پتھر کی طرح ساکت وجامد دکھائی دے رہے تھے۔ زمین کی سُرمئی سطح پر ان کے خاموش سائے میلوں تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ اُداس اور ویران سائے جو برف کی طرح سرد اور منجمد تھے۔ اچانک اسے اپنے جسم میں سرد لہریں رینگتی ہوئی معلوم ہوئیں اور وہ کپکپا کر رُک گیا۔ لوگ اسی طرح آ جا رہے تھے خاموش بے جان پتھر کی طرح ساکت اور جامد شکلیں۔ برف کی طرح سرد اور منجمد سائے بازاروں گلیوں میں اور مکانوں میں ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود تھے۔ اس نظارے نے اس کے دل میں یک لخت غم اور غصے کا طوفان بپا کر دیا اور اس کا جی چاہا کہ ان کے مُنہ پر زور سے تھوک دے ـــــ اسے حیرت تھی کہ آخر لوگ اتنے بے حس اور مطمئن کیوں معلوم ہوتے ہیں کیا انہیں وہ سب کچھ مِل چکا ہے۔ جس کی خاطر انسان برسوں سے جدوجہد کرتا آیا ہے؟ آزادی۔ اخلاق کی بلندی اور انسانیت کی تکمیل ہو چکی ہے؟ ہر شے عمل میں آ چکی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ سکون کیوں؟ یہ بے حسی جمود اور مہیب سناٹا کس لئے ہے ـــــ یہاں پہنچ کر وہ یکایک ٹھٹکا اور ایک خیال اس کے دل کی گہرائیوں میں چپکے سے جاگ اٹھا اسے یہ سوچ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ ممکن ہے۔ ان کے احساسات ہی مر چکے ہوں اور پھر اس کے کانوں کے قریب بڑے زور کا دھماکہ ہوا

اور تھوڑی دیر کے لیئے اس کے سمجھنے اور سوچنے کی قوتیں سلب ہوگئیں اسے اپنا وجود ایک ایسے خلاء میں لٹکتا ہؤا محسوس ہؤا جہاں چاروں طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی وہ خود ایک مُردہ تھا۔ ایک سانس لیتی ہوئی لاش اور معاً اسے محسوس ہؤا۔ کہ اس کے آس پاس ایسی سینکڑوں لاشیں لٹک رہی ہیں۔

وہ خوفزدہ ہو کر چونک پڑا اور لاشعوری طور پر اس کی نگاہیں اُوپر کو اُٹھ گئیں آسمان پر ستاروں کی لاکھوں ننھی ننھی قندیلیں جھلملا رہی تھیں۔ ستاروں کی کپکپاہٹ میں زندگی کی جھلک موجود تھی۔ چاند کی آہستہ خرامی میں بھی عمل موجود تھا۔ زمین پر لیٹے ہوئے عمارتوں کے سائے بھی آہستہ آہستہ اپنی شکلیں بدل رہے تھے پھر وہ کیوں خاموش تھا۔ بلا عمل و جہد جینے سے کیوں مطمئن تھا۔ کوئی ایسی چیز اس کے اندر کیوں نہیں آتی تھی جو اس کی زندگی کو اپنے آپ میں جذب کر لے کوئی تڑپتی ہوئی بے چین اور مضطرب ہستی جو اس کی رُوح کو اپنے سانس کی گرمی سے لپکتا ہؤا شعلہ بنا دے۔ اور اس کے اخلاق اور انسانیت کی تکمیل کر دے۔ اس کے ہاتھ اس طرح ہوا میں پھیل گئے۔ گویا وہ اس ہستی کو گم ہو جانے سے پہلے ہی قابو میں کر لینا چاہتا ہے۔ اسے اپنے آپ میں اور اپنے آپ کو اس میں سمو دینا چاہتا ہے۔ تاکہ کوئی رکاوٹ درمیان میں نہ رہے۔ جو کچھ ان دونوں کی ملاوٹ سے ممکن ہے وہ جلد سے جلد ہو جائے۔ اب اس سے زیادہ دیر انتظار نہیں

ہو سکتا تھا ۔۔۔۔ اسی سوچ میں وہ ایک چھوٹے سے بازار سے گذرا جس میں زیادہ بھیڑ بھاڑ اور شور و غل تھا دوکانوں کی مدھم ٹمٹماتی ہوئی بتیوں کی روشنی میں لوگ تختوں اور چارپائیوں پر بیٹھے نظر آرہے تھے ۔ اور ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے تھے وہ ایک ملے کے ہئے بجلی کے کھمبے کے پاس رکا اور اس خیال سے کہ شاید اسے اس کے تخیل کا کوئی حقیقی وجود مل جائے ۔ اس نے چاروں طرف گھور گھور کر دیکھا مگر ہر جگہ وہی مکروہ ملبے جیسی اور سکون موجود تھا ۔۔۔۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ ہر آدمی کے کان میں جا کر کہے کہ بھائی روحانی طور پر خودکشی کے بعد جسم ایک بے حقیقت شے ہے ۔ لگے ہاتھوں اس کا بھی قصہ چکا دو ۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آسکے پھر ۔۔۔۔ پھر کیا کرنا چاہئے کیسے ان کو بتانا چاہئے کہ آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لئے جس سیڑھی پر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اس کا پہلا زینہ عمل ہے اور آزادی کے بغیر سکون موت ہے ۔ اس کے ذہن میں دفعتہً ایک ابال سا اٹھا ۔ ایک گرم اور سیال شے اس کے عضو عضو میں رگ رگ میں سنسناتی ہوئی پھیل گئی اور اس کے شعور کی اتھاہ گہرائی سے ایک غیر مرئی ہیولی نے نمودار ہو کر چیکے سے مگر انوکھی آواز میں کہا "اب خاموشی گناہ ہے کہہ دو جو کچھ تمہارے سینے میں ہے اُگل ڈالو چیخ مار کر کہہ دو ورنہ یہاں کوئی انسان نہیں رہے گا ۔ کہو ۔ بولو ۔ خودکشی مت کرو ۔ خودکشی مت کرو"

اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ زور زور سے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ لیا

اور پوری قوت سے اس آواز کو دبانے کی کوشش کی جس میں فولاد کی سی سختی تھی ـــــ اسے اپنے آس پاس کی چیزیں دھندلی دکھائی دے رہی تھیں اور جسم میں ابلتے ہوئے لاوے کی سی جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ تم کس لیے سوچتے تھے۔ کسی نے اس سے ان بوجھی آواز میں پوچھا اور وہ اس لہجے کی متضاد حیثیتوں پر حیران ہو گیا آواز اس کی اپنی ہی تھی مگر یہ نیا اور تحکمانہ رنگ کس کا تھا۔ کیا اس کے اندر کوئی اور وجود بھی تھا۔ جو اس سے بازپرس کرنے اور اس کے اعمال کا جائزہ لینے کا مجاز تھا۔ مگر اب اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کا کھوج لگا سکے۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس کی توجہ کسی اور طرف ہٹ گئی اور وہ خاموش رہا تو وہ نامعلوم سیلاب عظیم جو اس کی چھاتی میں لہریں مار رہا ہے۔ یکایک تمام رکاوٹیں توڑ کر بہ نکلے گا۔ اور اس کی ہستی اس کا وجود کچھ بھی باقی نہیں رہے گا سب کچھ فنا ہو جائیگا۔ ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے گا ـــــ اس احساس سے اس کے اعضا میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اور نظروں کے سامنے صدہا میل تک سرخ سرخ ستارے پھیل گئے۔ فضا میں شفق کی سی لالی گھلتی دکھائی دی اور لاتعداد مہیب سائے بھاگتے ہوئے اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے وہ جلدی سے گھبرا کر دوڑا اور قریب ہی ایک دکان کے تختے پر چڑھ گیا ـــــ اور کپکپاتے ہوئے اس نے زور سے کہا:۔

"سنو" ـــــ چارپائیوں کی قطار میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ دکانوں اور تختوں سے اٹھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ چھوٹے بچے بھی کھیل چھوڑ کر آنکھیں جھپکاتے

ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے" کسی نے حلوائی کی دکان سے بھیڑ کو دیکھ کر پوچھا۔

"اجی کوئی دوا فروش ہو گا یا بدمعاش بھکاری" حلوائی نے جھک کر بھٹی کی آگ دیکھتے ہوئے کہا۔ ان لوگوں کے پاس دنیا کو لوٹنے کے بہتیرے ڈھنگ ہیں۔ دیکھئے لیڈر کی سی شان سے کھڑا ہے مگر ابھی کسی نہ کسی چیز کے نمونے بانٹے گا یا اپنی غربت کی کہانی سنا کر لوگوں کو احمق بنانے کی کوشش کریگا — اور دوسری طرف وہ ہجوم کے سامنے کھڑا جذبات کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ خیالات تیز بارش میں ابھرتے ہوئے بلبلوں کی طرح اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ اور اسی سرعت سے پھٹ رہے تھے اتنا کچھ اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔ کہ وہ اس پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ زور زور سے چلائے چیخے اور لوگوں کو بتائے کہ — کہ — مگر اس کی آواز تھرا رہی تھی اور حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس وقت اسے پہلی دفعہ یہ خیال آیا کہ اس کے پاس ہجوم کو کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے — اس نے قمیص کا کالر کھینچ کر گلا صاف کیا اور کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے کیا کہے لوگ اس کی خاموشی اور اضطراب کو رحم، استہزاء اور حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ اسے بڑی شرم محسوس ہوئی کہ اتنے لوگ اس کی باتیں سننے کے منتظر ہیں۔ اور وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں — چنانچہ اس نے گھبرا کر کہا — میں میں — وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ جو آواز اس کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس پر زخمی کراہ کا گمان ہوتا تھا۔ یکایک ہجوم میں سے

کوئی شخص بکرے کی طرح ممنایا اور مجمع زور زور سے ہنسنے لگا۔۔۔۔۔

اس نے طنز اور استہزا کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا مگر اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔ اس کا چہرہ اپنی ناکامی کی شرم اور غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کر کے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ لوگوں کی غلط فہمی دور کرے اور انہیں سمجھائے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے وہ سانس لینے کی طرح ضروری ہے۔ مگر مجمع ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکا تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑے طنز سے ہنس رہے تھے۔ اسے اپنی ذات بڑی حقیر معلوم ہونے لگی۔ وہ بلندی جس پر وہ کھڑا تھا ایک غار کی نامعلوم گہرائی بن گئی اور اسے غار کے دہانے پر چند بھیانک عفریت جھانکتے اور قہقہے لگاتے ہوئے نظر آئے اس کے سامنے بھی تو عفریت ہی کھڑے تھے۔ پست قد ظالم خونخوار اور بے رحم۔ جو اس پر ہنس رہے تھے۔ اور اس کے مقدس جذبے کی توہین پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اب انہیں کچھ بھی نہ کہنا چاہتا تھا۔ اسے ان سب سے شدید نفرت ہو چلی تھی۔ چنانچہ وہ جلدی سے تختے پر سے اترا اور بھیڑ کو ہٹاتا ہوا گلی میں پہنچا اور بھاگ نکلا۔

وہ دور تک اندھیری گلیوں میں بھاگتا چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے موڑوں پر تیزی سے مڑتا نالیاں پھلانگتا لوہے کے گڑے ہوئے پست قد کھمبوں سے بچتا اور دیواروں سے ٹکراتا ہوا دوڑتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ دور ایک سڑک پر نکل گیا۔ جس کے پرے ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی رفتار

ہلکی ہوئی اور وُہ میدان کی طرف ہو لیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے رُک کر اس گلی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ جہاں سے وہ ابھی ابھی نکلا تھا۔ وہ اندھیری اور سنسان پڑی تھی۔ اور دُور ایک موڑ پر لگی ہُوئی بجلی کی بتی اپنے ارد گرد بیمار اور زرد روشنی پھیلا رہی تھی۔ اسے یُوں محسُوس ہوُا۔ کہ جیسے وہاں کسی بتی کا وجُود نہیں بلکہ اس کی آنکھ سے نکلا ہوُا ایک اُداس آنسو وہاں جم کر رہ گیا ہے۔ ہجوم کی ہنسی ابھی تک اس کے کانوں میں تھرا رہی تھی۔ وہ آہستہ سے مُڑا اور میدان میں داخل ہُوا۔ چھوٹی چھوٹی سبز گھاس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس پر چاندنی کھیل رہی تھی۔ میدان کے کنارے پر اُونچے اُونچے درخت خاموش کھڑے تھے۔

اس منظر نے اسے کچھ تسکین بخشی اور جو کچھ چند لمحے پہلے عمل میں آچکا تھا۔ اس پر ٹھنڈے دِل سے سوچنے کا موقع مِلا۔ اب وُہ بڑے اطمینان سے اپنی ناکامی کے اسباب معلوم کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک خواب دیکھا —— جو ناکام رہا۔ اب وہ اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ سوچ اور خواب میں کیا فرق ہے۔ "مگر میرا خواب ناکام کیوں رہا؟" اس نے سوچا "شاید اس لیئے کہ میں نے کبھی خواب دیکھا ہی نہ تھا۔ میرے ذہن میں اس کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ اور جب میری آنکھوں نے اسے دیکھا تو وُہ اس کی تاب نہ لا سکیں۔ در اصل —— اس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔ "بھئی یہ سب تمہارا اپنا ہی قصور ہے۔ تم اس کے لیئے تیار ہی نہیں تھے۔ یہ تمہاری اپنی کمزوری کی سزا ہے" وہ ناکامی کی تلخی کے باوجود مُسکرایا اور گھاس پر بیٹھ گیا۔ ہری ہری گھاس

پر کھلی ہوئی چاندنی بے حد خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نگاہوں نے میدان کی سطح کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چکر کاٹنا شروع کیا۔ نرم نرم سبزہ، چاندنی کی سیمیں کرنیں، چھوٹے چھوٹے سفید پودے تسلسل کے ساتھ اس کے سامنے سے گزرے۔ اور جب سارا منظر ختم ہو چکا تو اچانک اس کی نگاہیں اپنے قریب ہی ایک چھوٹی سی جگہ پر جم کر رہ گئیں یہ جگہ باقی میدان سے مختلف سی معلوم ہوتی تھی اس نے جھک کر دیکھا تو نرم اور ملائم گھاس کی جگہ کچلے ہوئے اور زرد رو ریشے اس حصے میں کثرت سے موجود تھے۔ اس خطے میں وہ زرخیزی اور خوبصورتی نام کو بھی نہ تھی۔ جو میدان کے باقی حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ذرا غور سے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی وجہ سے معلوم ہو گئی۔ یہ جگہ دو سڑکوں کے درمیان واقع ہونے کے باعث لوگوں کی گذرگاہ بن چکی تھی اور بھاری بھاری اجنبی قدموں نے اس کی رونق کچل ڈالی تھی۔ اس کے خیال نے بڑی سرعت سے لکیریں کھینچ کر دنیا سے ملتا جلتا نقشہ اس میدان میں پھیلا دیا۔ ہر طرف بہار چھا رہی تھی۔ نکھرے ہوئے پھول جھوم رہے تھے۔ نرم نرم روئیدگی اور ہرا ہرا سبزہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر ایک خطہ جس کے قریب وہ بیٹھا تھا اسی طرح بے رونق تھا۔ بھاری بھاری اجنبی قدم اس کی روئیدگی کو فنا کر رہے تھے۔ اس کی نمود کو دبا رہے تھے۔ اس کے پھلنے اور پھولنے کی راہ میں سختی سے حائل تھے پھر یہ خطہ کیسے فروغ پا سکتا تھا۔ اس کے پیلے اور جھکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کیسے آ سکتی تھی اس نے سوچا کہ ایک ہی صورت ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ کوئی طاقت ان راہ گیروں کا اِدھر سے آنا جانا ہی بند کرا

دے۔ تبھی کچھ عمل میں آسکتا ہے۔ اگرچہ اس کے دماغ میں اس طاقت کی کوئی واضح شکل نہ آئی مگر اس کا احساس ضرور ہوا۔ اور اس نے خیال ہی خیال میں توقع کی کہ وہ ان بے رحم اجنبی قدموں کو ادھر سے گذرنے پر ٹوکے گی۔ انہیں یہاں سے نکلنے پر مجبور کرے گی اور اگر وہ نہ مانے تو ——— تو وہ عظیم طاقت ان پر جھپٹ پڑے گی مارے گی۔ توڑے گی۔ اور ان کے اعضا کے پرخچے اُڑا دے گی ——— وہ اپنے ہیبتناک خیال سے خود ہی کانپ اُٹھا۔ "اچھا بھئی فرض کرو کہ وہ طاقت ناکام رہی"۔ کسی نے اس سے چپکے سے حجت کی۔ ——— پھر پھر ——— واقعی یہ قابلِ غور بات ہے"۔ اس نے چونک کر کہا "مجھے تو اس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ اگر وہ طاقت اس مقدس جد و جہد میں ناکام رہی۔ تو انجام موت کی طرح بھیانک ہو گا۔ مہیب اجنبی قدم نفرت کے شدید احساس سے سارے خطے کو تباہ کرنے پر تل جائیں گے۔ اور پھر چھوٹے اور بڑے پودوں میں کیا امتیاز ہو گا؟ ——— سبھی یکساں طور پر کچلے جائیں گے۔ تو پھر یہ اشد ضروری ہے کہ وہ طاقت جد و جہد شروع کرنے سے پہلے مکمل تیاری کرے۔ یہاں سے غیر شعوری طور پر اس کا ذہن اپنے حادثے کی طرف منتقل ہو گیا اور اپنی ناکامی کا سبب روشن نقطے کی طرح اس کے سامنے جم گیا۔ وہ اس لئے ناکام رہا تھا۔ کہ جو کچھ اس نے کیا اس کے لئے وہ تیار نہیں تھا۔ اچانک سڑک پر ایک کُتا زور سے بھونکا اور وہ چونک پڑا۔ میدان میں چاندنی سبزے پر اسی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ درخت بدستور سر جھکائے خاموش کھڑے تھے اور خالی سڑک پر دُور سے ایک تانگے کی سُرخ بتیاں آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھیں

وہ چپکے سے اُٹھا اور واپس ہو لیا۔ اس کے دِل میں شکست کی جو آگ جل رہی تھی اس کے شُعلے سرد پڑ چکے تھے اور اس کی بجائے ایک نیا اور تابال شعلہ بھڑک رہا تھا —— امید اور اُمنگ کا شعلہ جو اس کے دِل میں عمل کی روشنی اتار رہا تھا۔ وہ جان چُکا تھا۔ کہ اس کا دُشمن بہت طاقتور ہے اور اسے شکست دینے کیلئے جذبات کی رَو میں بہنے سے زیادہ استقلال اور ٹھوس عمل کی ضرورت ہے۔ ناکامی کا احساس اب اس کی ہمت کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اور کوئی جیسے سرگوشی میں اس سے کہہ رہا تھا کہ —— "شکست ہی فتح کا زینہ ہے" وہ سڑک سے گذر کر ایک چھوٹے سے پُل پر پہنچا اور اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ اس کی نظروں کے سامنے دُور تک ایک آسمانی رنگ کی روشنی پھیلتی چلی گئی ہے اور اس میں سُرخ اور سبز بتیاں جگمگا رہی ہیں۔ وہ آہستہ سے دُوسری طرف اُترنے لگا —— اس کے پیچھے اندھیرے کے کثیف پردے میں لپٹا ہوُا اس کا ماضی چُپکے چُپکے رو رہا تھا ——!!

میرا گھر

جب میں شام کو قبرستان میں بیٹھا اپنے گھر کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ارد گرد پھیلی ہوئی لاتعداد قبروں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ عرصے سے میری عادت ہو گئی ہے کہ دن ڈوبتے ہی ٹہلتا ٹہلتا شہر سے باہر نکل کر قبرستان کو ہو لیتا ہوں اور مٹی کے بھیانک ڈھیروں پر بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں سوچتا ہوں۔ خزاں رسیدہ درختوں سے گذرتی ہوئی ہوا اداسی سے گنگناتی ہے اور میرے ذہن میں عجیب عجیب سوال کروٹیں لیتے ہیں۔ تنہائی اور مکمل سکوت کے اس وقفے میں جب صرف کسی بوڑھے گدھ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہی توڑتی ہے میری روح ایک تکلیف دہ لذت سے لبریز ہو جاتی ہے۔ اور موت کا ڈوبتا ہوا

ستارہ میری نگاہوں میں جھلملانے لگتا ہے۔ جُوں جُوں آسمان پر چاند اُبھرتا ہے اور اس کی زرد روشنی قبروں کی خاموشی میں گھُلنے لگتی ہے۔ کوئی نہ کوئی سوال فریاد کی طرح اُبھر کر میرے شعور کو تسلّی کی سوچ پر مجبور کرتا ہے۔ اس وقت مجھے یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی سوالات کا ایک مجموعہ ہے۔ اور انسان محض ان سوالات کا جواب دینے کیلئے جنم لیتا ہے۔ اس طرح میری سوچ ہمیشہ عمل میں مصروف رہتی ہے اور میری تسکین کی بھُوکی رُوح کو بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔ چند دن ہوئے مجھے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اور اس واقعے نے بعد میں ایسی پیچیدہ سوالیہ شکل اختیار کرلی کہ میرا ذہن اسے کسی طرح بھی قبول نہ کر سکا۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اسے فراموش کردوں مگر نہ تو میں اسے بھُولنے میں کامیاب ہو سکا اور نہ مکمل طور پر قبول کر سکا۔ اس لئے میں یہ سوال جُوں کا توُں آپ کے سامنے پیش کرتا ہُوں۔ میں ایک افسانہ نگار ہُوں میری ملاقات ہر قسم کے آدمیوں سے ہے جو خود بخود میرے افسانوں کا مواد فراہم کرتے ہیں عموماً میں ان لوگوں سے زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہُوں جو میری زندگی کے اس فنی پہلو سے واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں۔ اس میں ایک ٹھوس اور آسمانی سچائی پائی جاتی ہے۔ اور ان میں اس حقیقی انسان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو بُرائی اور تباہی کی گہری غاروں سے سر اُٹھا کر دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو بغیر کسی جھجک کے عُریاں پیش کر دیتا ہے۔ چند دن ہوئے مجھے ایک ایسے ہی آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں اخبار کے دفتر سے نکل کر سڑک پر کھڑا سگریٹ سُلگا رہا تھا کہ اس نے مجھ سے ماچس کی ڈبیا مانگی اور جیب سے آدھی جلی ہوئی بیڑی کا

ایک ٹکڑا نکال کر اسے جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ کسی طرح بھی جلنے میں نہ آیا تو میں نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر پیش کیا۔ اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا اور سگریٹ سلگا کر میرے ساتھ ہو لیا۔ مجھے اس کے بڑھے ہوئے بال اور بے نیازی پسند آئی۔ اور میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس کی گفتگو بڑی دلچسپ تھی۔ اور وہ اس طرح بے تکان باتیں کر رہا تھا جیسے یہی اس کا پیشہ ہو۔ اس کا بیان تھا کہ اسے روٹی حاصل کرنے کیلئے کسی دفتر میں جو یہاں سے ۳۵ میل دور واقع تھا صبح سے لیکر شام تک کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر اتنی مصروفیت کے باوجود زندگی کے متعلق اس کے سوچنے کا انداز خوب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی ایک پتھر ہے اور انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ ایک ماہر سنگتراش کی طرح اسے کاٹ کاٹ کر اپنی پسند کا مجسمہ تیار کرلے۔ گو اس کی باتوں اور اس کے عمل میں مکمل تضاد موجود تھا اور وہ یہ نظریہ پیش کر کے خود ہی اپنی مخالفت کر رہا تھا۔ مگر اس کی گفتگو سے خلوص کی بو آتی تھی۔ اس لئے میں آخر تک اس کی سادہ لوحی پہ ہنسنے میں متامل رہا۔ باتیں کرتے وقت اس کی آنکھیں دفعتہً چمک اٹھتی تھیں۔ جیسے کسی بے باک روح کا عزم جھلکتا ہو جب وہ بہت کچھ کہہ کر رخصت ہونے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟" یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر مردنی چھاگئی اور اس نے ایک کرب کے ساتھ آنکھیں بند کر کے کہا۔

"میں کہیں نہیں رہتا۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ آپ کا بھی نہیں کسی کا بھی نہیں گھر ایک ادھورا فریب ہے۔ اور سب انسان اس فریب میں مبتلا ہیں۔"

یہ کہکر وہ جلدی سے باہر نکل گیا اور دروازہ ایک چیخ کے ساتھ بند ہوگیا۔

اس کے بعد وہ مجھ سے کبھی نہیں ملا۔ لیکن اس کی یاد میرے ذہن میں ایک لمبی میخ کی طرح گڑ گئی ہے جسے نکالنا میرے بس کا روگ نہیں اس کی یاد آتے ہی اس کی ساری زندگی تصویر کی طرح میری آنکھوں میں کھنچ آتی ہے۔ اور زندگی کا ایک بھیانک پہلو پوری تلخی کے ساتھ مجھے متاثر کرتا ہے۔ اس نے جو کچھ مجھ سے بیان کیا اس میں وُہی خیال جھلکتا تھا جو اس نے رخصت ہوتے وقت بیان کیا اور اس کی کیفیت یہ ہے "صُبح سات بجے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیدار ہوتا ہُوں۔ دیوار پہ ایک ٹوٹا ہوا کلاک ٹک ٹک کرتا ہُوا کمرے کی خاموشی توڑنے میں مصرُوف نظر آتا ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے جلدی سے لحاف پھینک کر سردی میں ٹھٹھرتا ہُوا دفتر جانے کے لیئے تیار ہوتا ہُوں اور اسٹیشن کو ہو لیتا ہُوں۔ راستے میں اکّے دُکّے فقیر سلگتی ہُوئی گھاس پھُوس کے قریب سُکڑے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ یا چند میرے ہی پیشے کے لوگ ہاتھ میں روٹی کے ڈبّے سنبھالے خالی سڑک پر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں بھی تیزی سے چلتا ہُوں۔ تاکہ وقت پر اسٹیشن پُہنچ جاؤں۔ تھوڑی دُور جا کر سردی میں کانپتے ہُوئے مزدُوروں کے غول ایک نئی بنتی سڑک پر کُدالیں چلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے قریب سے گذرتا ہُوا میں اس جمعدار کو بھی دیکھتا ہُوں جو ایک لمبا گرم کوٹ پہنے ہمیشہ انہیں موٹی موٹی گالیاں بکتا نظر آتا ہے۔ میں رُک کر اسے کچھ کہنا چاہتا ہُوں۔ مگر لکڑی کا

وہ مستطیل پُل جسے مجھے ہر روز عبور کرنا پڑتا ہے غلیظ دھند میں لپٹا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی نم آلود سطح پر چڑھتے ہُوئے میرے قدم کئی بار پھسلتے ہیں۔ مگر میں جلدی جلدی اُوپر پہنچ جاتا ہُوں۔ اور جب وہاں سے پلٹ کر دیکھتا ہُوں تو مزدور سایوں کی طرح حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی شاید ایک سایہ ہی ہے جو کچھ دیر خاموشی سے زمین پر تڑپ کر مٹ جاتا ہے۔ پُل کے نیچے ریل کی بھیگی ہوئی پٹریاں دھند میں گم ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان کے درمیان چند کلرک ہانپتے کانپتے بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسٹیشن پر گاڑی پہنچتی ہے اور وہ زیادہ تیزی سے بھاگنے لگتے ہیں۔ میں بھی دوڑتا ہوں حتّٰی کہ اسٹیشن پر پہنچتا ہُوں اور گاڑی کے پچھلے ڈبہ میں بیٹھ جاتا ہُوں۔ اس گاڑی کے پچھلے ڈبے صرف ملازموں کے بیٹھنے کے لیئے وقف ہیں۔ ان ملازموں کی ایک یونین بھی ہے جس کا سال بھر میں ایک اجلاس بھی نہیں ہوتا۔ اور اس یونین کی طرف سے تین چار منتخب نمائندے ڈبوں کے باہر گھوم رہے ہیں تاکہ دُوسرے مسافروں کو ان انسانوں کے ساتھ بیٹھنے سے روک دیں جنہوں نے سوچ اور وقار بیچ کر جھوٹی خوشی، ترقی اور خود فریبی کا سودا کیا ہے۔ ہانپتے ہوئے کلرک ابھی آ رہے ہیں۔ اور پٹریاں نیچے آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی بیڑیوں کے غلیظ دھوئیں سے تر ہو رہی ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ سگرٹ بھی سفید لکیر کی طرح جلتا نظر آ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹائی کی گرہ بھی آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کئی کلرکوں کو کھانسی کے بیک وقت اور بے تحاشا دورے پڑتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگتی ہے۔ دو سڑکوں کے درمیان کانپتے

اور زور زور سے سانس لیتے ہوئے کلرک پوری طاقت سے بھاگتے ہیں آخری
ڈبوں سے ان کے ساتھی اور پلیٹ فارم پر کھڑے مسافران پر ہنستے ہیں ان میں
سے کچھ پٹریوں میں اُلجھ کر گر پڑتے ہیں کچھ ہار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جو بھی
دوڑ کر گاڑی پکڑ ہی لیتے ہیں وہ پندرہ بیس منٹ تک مُردوں کی طرح سیٹ پر
پڑے لمبے لمبے سانس لیتے رہتے ہیں۔ ہر طرف پریشان اور کھُردرے حُلیے
نظر آتے ہیں۔ خشک بال، بڑھی ہوئی داڑھیاں بے ترتیب کپڑے جن پر
جگہ جگہ سیاہی کے دھبے مستقل آرائش کی شکل میں نظر آتے ہیں عجیب قسم کا اُداس
ماحول تعمیر کرتے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ آخر یہ لوگ کیوں ایسی زندگی
کے خوگر ہیں جس میں انہیں اپنا جسم تک صاف کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس خطے
میں کتنے اور ایسے انسان بستے ہیں جو ایک ہی دائرے میں آنکھیں بند کئے چکر
لگانے میں مشغول ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس دائرے کو پھاند کر چند نئی
اور روشن لکیروں کو بھی چھوا جا سکتا ہے۔ میں ان کے چہروں کو دیکھتا رہتا
ہوں۔ اور ایک گھناؤنا خیال میرے ذہن میں اُبھر کر چکر لگاتا رہتا ہے
میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ ہمدردی اور محبت کے قابل ہیں۔ کیا
ان سے شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مگر وہی خیال مجھے ہر بار جواب دیتا ہے
کہ یہ لوگ محبت کے قابل نہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر غلط سودا کیا ہے۔ یہ
فریبی خریدار ہیں۔ انسانیت کی غلط قیمت مقرر کرنا زندگی سے سب سے بڑا دھوکا
ہے۔ اس لئے ان سے نفرت کرو ۔۔۔ نفرت کرو ۔۔۔ اور واقعی مجھے ان سے
نفرت ہونے لگتی ہے۔ مگر جب میں ان کے خشک چہروں پر ہنسی کی تحریریں دیکھتا

ہُوں۔ تو مجھے یُوں محسُوس ہوتا ہے جیسے یہ لوگ نفرت کے بھی قابل نہیں ہیں۔ ان کی مُسرّت بھونڈے طریقہ سے زندگی کا مُنہ چڑانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ جتنا کچھ وہ برداشت کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ رُد کھے قہقہوں کی بجائے تلخ تبسم بن کر ہونٹوں پر ڈھلنا چاہئے۔ انہیں جھوٹی خوشی کے لبادے اتار کر اپنے آپ کو بالکل عُریاں پیش کرنا چاہئے۔ تاکہ ایک اور ناسُور کا کرّاہ اور وہ سماج کو چیخ مارنے پر مجبُور کر دے۔ جب میں اپنے خیالات سے چونکتا ہُوں تو تمام کلرک ٹولیوں میں بٹ کر ہنستے، گالیاں بکتے اور دفتر کے معاملات پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض تاش اور رمی کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور کونے میں بیٹھ کر سونے والوں میں ایک شاعر بھی اُونگھتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو باتیں کرتے وقت ایک منٹ میں دو سو کے قریب الفاظ بولنے کے عادی ہیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر معاً مجھے اپنے کمرے کے پُرانے برتن یاد آجاتے ہیں جو مہینوں سے ایک ہی جگہ پڑے ہُوئے دیواروں کو گھُورتے رہتے ہیں۔ مجھے اس خیال سے بڑی تلخی ہوتی ہے کہ جس طرح میں اپنے کمرے میں تنہا زندگی بسر کرتا ہُوں اسی طرح یہاں بھی اکیلے انسان کی طرح رہتا ہُوں۔ گاڑی تیزی سے بھاگتی چلی جاتی ہے اور میں سوچتا ہُوں کہ پُرانے برتنوں کی خاموش نگاہیں کب تک دیواروں پر جمی رہیں گی۔ کیا مجبُوری کی زنجیریں کبھی نہ ٹوٹیں گی؟ سرد نگاہوں میں کبھی شعلے نہ تڑپیں گے۔ گونگے حلق کبھی فریاد نہ کریں گے؟ رُوح کو مقید رکھنے والی یہ دیواریں کبھی نہ ٹوٹیں گی؟ وہ کون سی خوش نصیب ساعت ہوگی جب انسان گریز چھوڑ کر عمل کا آغاز کریں گے؟ اور ان کے بیباک ہاتھ ان دیواروں کو ریزہ ریزہ

کر دیں گے جنہوں نے زندگی کو خوفناک طریقے پر محدود کر رکھا ہے میں سوچتا رہتا ہوں اور میری رُوح غم اور غصّے کے ٹوٹتے ہوئے شعلوں میں گھری ہوئی ایک ایسی اُمید سے تسکین حاصل کرتی ہے جس کے روشن دائرے میں سنجیدہ اور پُرعزم انسان کے خدوخال جھلکتے ہیں۔ اسی کشمکش میں ۳۵ میل گزر جاتے ہیں اور گاڑی گڑگڑاتی ہوئی اسٹیشن پر پہنچ جاتی ہے۔ کلرکوں کے گروہ کے گروہ ڈبوں سے نکل کر ریلوے لائنوں کو عبور کرتے ہوئے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے مسیح کی بھیڑوں کو کوئی زبردستی سیاہ دڑبوں کی طرف ہانکے لئے جا رہا ہو۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا ہوا دفتر پہنچتا ہوں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دفتر کا پست قد نیپالی چپڑاسی جو ایک آنکھ سے خوفناک طور پر کانا اور بدصورت ہے جھک کر سلام کرتا ہے۔ مگر میں اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہوں میرے ساتھ کام کرنے والے کلرک خراب نل سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی طرح دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں کھلکھلاتے اور باتیں کرتے دروازے میں ٹپکتے جاتے ہیں اور میں آگ سے بھری ہوئی انگیٹھی کے پاس ٹہلتا ہوا ان کی ہندوستانی اور انگریزی سلامیں سُنتا رہتا ہوں۔ وہ کمرے میں قدم رکھتے ہی تیزی سے اپنے غیر ملکی آقا کے دروازے کا رُخ کرتے ہیں۔ اور وہاں سے یوں مسکراتے ہوئے نکلتے ہیں گویا رات بھر کوئی بھاری بوجھ ان کی رُوح کو پیستا رہتا ہے۔ اور اس سلام کے بعد کم از کم ایک دن کے لئے انہیں اس سے نجات مل جاتی ہے۔ کچھ دیر تک دفتر مختلف قسم کے شور سے بھرا رہتا ہے حتیٰ کہ ہیڈ کلرک صاحب ناک پر جھکی ہوئی عینک میں سے چاروں طرف گھورتے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی کلرکوں کو ہنسی کی قبض ہو جاتی ہے

اور ان کے ہونٹ خوشامد کے لعاب سے چمکنے لگتے ہیں۔

"آج تو ہمارے لالہ جی بڑے چہکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"

"اجی اب تو انہیں چھ کا گریڈ ملنے والا ہے۔ بس وارے نیارے ہیں"۔

"ہیں۔ سچ کہنا غازی صاحب تمہیں انہی کے سر کی قسم"

"اماں بھئی ہم غلط کہنے والے ہیں — ہم پہ یقین نہیں تو کرتار سنگھ سے پوچھ لو"

"تو کرتار سنگھ کی بھی ایک ہی کہی — اجی آپ اور غلط کہیں۔ لاحول ولاقوۃ"

"ارے بھئی ہم پہلے ہی جانتے تھے — دراصل سمتھ صاحب سے اِن کا بڑا وہ ہے"

"کیا —؟ وہ کیا بھئی!"

"اجی یارانہ اور کیا۔ وہ انہیں نہ ترقی دینگے تو اور کسے دینگے؟

خیر مبارک ہو۔ مٹھائی کھلوائیے"

ہیڈ کلرک صاحب مشین کی طرح ایک ایک کو چشمے میں سے گھورتے ہوئے مسکراتے رہتے ہیں اور جب سب کلرک باتیں ختم کر چکتے ہیں تو انہیں کام شروع کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ سب منہ لٹکا کر مڑتے ہیں اور اپنی اپنی میزوں پر جھک پڑتے ہیں۔ میرے لیے یہ باتیں کوئی نئی نہیں ہوتیں بلکہ ایک پرانے ریکارڈ کی طرح ہمیشہ ایک ہی عبارت کو دہراتی ہیں۔ اور میں کئی مہینوں سے اس عبارت کو سننے کا عادی ہو چکا ہوں۔ دفتر میں مکمل خاموشی چھا جاتی ہے اور ٹائپ رائٹر کی مسلسل ٹک ٹک نمایاں طور پر ابھر آتی ہے۔ کبھی کبھی دو کلرکوں

کی مخصوص ہنسی بھی سُنائی دے جاتی ہے جن کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ چونکہ خود انہیں ہنسنے کا مرض ہے اس لئے ساری دُنیا کو بے معنی طور پر کھلکھلانا چاہیئے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے ہنستے چلے جاتے ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھئی آخر یہ کیا دیوانگی ہے تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ "ہم خاموش رہ کر دق کا روگ نہیں خریدنا چاہتے"۔

"کیس نمبر سولہ سوا کیس کدھر گیا بھئی؟ بہاری لال ..... مسٹر ذرا۔ میرا مطلب ہے یہاں آ ذرا۔" اچانک ہیڈ کلرک کی آواز گونجتی ہے۔

"آیا جی!" بہاری لال پگڑی سنبھالتے ہوئے دوڑتے ہیں۔

"میں نے کہا اس کیس کے ساتھ سولہ سوا کیس کی فائل لگی ہوئی تھی وہ کہاں گم ہو گئی۔" ہیڈ کلرک چشمے میں سے گھور کر کہتا ہے۔

"فائل وہ ـــ ساتھ ہی ہو گی ـــ دیکھوں کیا نہیں ہے۔" بہاری لال کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بیکار کیس کے ورق اُلٹتے ہیں۔

"دیکھئے مسٹر یہ پانچواں موقع ہے کہ آپ نے پھر بے پروائی سے فائل گم کر دی۔ آخر آپ دفتر کو کیا سمجھتے ہیں۔ کیا یہ کوئی لائبریری ہے کہ جہاں چاہا اخبار کو پھینک دیا۔ تعجب ہے کہ پندرہ سال کی ملازمت کے بعد بھی آپ کو کام کرنے کی تمیز نہیں آئی۔ جائیے فائل ڈھونڈیئے میں آپ کو آخری موقع دیتا ہوں۔ سُن لیا آپ نے؟"

بہاری لال خاموشی سے واپس آ جاتے ہیں۔ اس کھلی توہین سے ان کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ مگر خاموش ہیں۔ خاموش رہیں گے اور چُپ چاپ سب کچھ

سہہ جائیں گے۔ شاید اس لئے کہ وقتی مسرت اور سفید پوشی کی کینچلی ان کی غیرت کو اپنے جال میں پھانس چکی ہے۔ اور اس نے بہاری لال جیسے سینکڑوں انسانوں کی ان باغی رُوحوں کا گلا گھونٹ دیا ہے جو عزت کے زخم خوردہ ہونے پر قابلِ شکست بغاوت کے گیت گاتی ہیں۔ میں میز پر جھکا ہوا خیالات کے سمندر میں ڈوبا رہتا ہوں۔ اور میرے ہاتھ سفید کاغذوں پر تیزی سے سیاہ لکیریں کھینچے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لکیریں یکایک اُبل کر لہروں کی طرح ایک دُوسرے کی طرف بڑھتی ہُوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور کبھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور سیاہ کیچڑ کی طرح میلوں تک پھیل جاتی ہیں۔ اس کیچڑ میں لاتعداد کچھوے گندگی میں لتھڑے ہوئے آہستہ آہستہ رینگتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں کانپ کر چونک اُٹھتا ہُوں اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہُوں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ساتھی بھی زندگی کے سمندر کے کچھوے ہیں جو سدا کنارے پر ایک چھوٹے سے حلقے میں پھرتے رہتے ہیں۔ وُہ طوفان میں لہروں کو چیرنے اور پانی میں چھپی ہوئی چٹانوں سے ٹکرانے کی اس لذت سے ناآشنا ہیں جن کو ایک نڈر مچھ جان بُوجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے سُنائی دیتے ہیں کہ اپنے گھر میں سر چھپا کر بیٹھ رہنا سمندر میں کودنے سے کہیں بہتر ہے۔ مگر وہ اس گھر کی جس کا گیت ہمیشہ ان کے ہونٹوں کو شگفتہ رکھتا ہے۔ کبھی وضاحت نہیں کر سکتے۔ اِن کے گھروں کا خیال آتے ہی میری نگاہوں میں سیاہ کیچڑ اُبلنے لگتا ہے اور کوئی چپکے سے میرے کان میں کہتا ہے۔ "زمین پر صرف با عمل اور باغی انسان ہی رہ سکتے ہیں۔ وقتی مسرت ڈھونڈنے والوں کے لئے سب سے

محفوظ جائے پناہ یہ کیچڑ ہے۔ سِسکتا ہوا کیچڑ جس میں ڈوب کر وہ زندگی سے فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ زندگی اور فرار ــــــ زمین اور انسان مُردہ روحیں اور سِسکتا ہوا کیچڑ ــــــ اور اس کے ساتھ ہی ایک طویل طنزیہ قہقہہ سُنائی دیتا ہے جس سے میرا خون جم جاتا ہے۔ میں گھبرا کر ٹہلنے لگتا ہوں اور دفتر کی ہر چیز مجھے سیاہ اور بھیانک دکھائی دینے لگتی ہے۔ کرسیاں میز کاغذ انسان سب کیچڑ میں ڈوبتے ہوئے تاریک سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور زندگی ایک نہ ڈھلنے والی رات کی طرح معلوم ہونے لگتی ہے۔ پانچ بجے میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا اُٹھتا ہوں اور اسٹیشن کو ہو لیتا ہوں۔ رات کو سردی میں کانپتا ہوا جب دوبارہ لکڑی کے اس پُل کو عبور کرتا ہوں تو پٹڑیوں کے درمیان لگی ہوئی سُرخ بتیاں انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے میرے خیالات ایک عظیم خطرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور یہ سُرخ نشان میرے لئے آخری اشارے کا کام کر رہے ہیں۔

جب تک میں اس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اس کا سنجیدہ چہرہ اور آنکھوں کی چمک مجھے نہیں بھولتی۔ وہ ایک بُری زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر اس کی باتوں میں مایوسی اور اعتماد دونوں کی جھلک تھی۔ اسے اپنے طبقے اور ماحول سے نفرت تھی۔ مگر کبھی کبھی اس نفرت میں بھی محبت چمک اُٹھتی تھی اور وہ اپنے ساتھیوں کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی کے خواب دیکھنے لگتا تھا۔

جب میں خیال کرتا ہوں کہ اسے کتنا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے تو میں کپکپا اُٹھتا ہوں۔ وہ اور اس جیسے کروڑوں اِنسان زندگی کا ناقابلِ برداشت بوجھ اُٹھائے ایک لمبی سیاہ لکیر پر رینگتے چلے جاتے ہیں کہیں کہیں جب ان کی کمر بہت ہی جھک جاتی ہے تو وہ رُک کر سستا لیتے ہیں اور پھر اسی لکیر پر ہو لیتے ہیں جو اُفق کے قریب پہنچکر یکایک نظروں سے گُم ہو جاتی ہے ان کا بوجھ انہیں زمین کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ وسیع اور نکھرے ہوئے آسمان کے فرحت بخش نظارے سے محروم آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ لکیر کی سیاہی میں ان کا وجود مدھم پڑھتا ہؤا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

جب میں سوچتا سوچتا تھک جاتا ہوں اور لوٹنے کے لیئے اُٹھتا ہوں تو اس کے آخری الفاظ آتشیں شکل اختیار کر کے فضا میں کراہتے ہیں مُرجھائے ہوئے پتے زمین پر اِدھر اُدھر لوٹتے ہیں۔ چاند کی زردی اور بڑھ جاتی ہے اور قبروں سے بڑبڑاہٹ سُنائی دینے لگتی ہے ——!!

اُچھال

اُس دِن میں ایک سیاسی جماعت کے سالانہ جلسے میں والنٹیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ایک وسیع پارک میں ہری ہری دوب پر خیموں کے ایک وسیع شہر کو دو دِن کیلئے آباد کرنے کے لئے۔ . . . . . . تمام طریقے برتے گئے تھے پارک کے کنارے کنارے بجلی کے قمقموں کی ایک رنگین قطار قوس و قزح کی طرح چمک رہی تھی اور اس کے درمیان نیلی اور سُرخ روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے دروازے پر جھنڈے کا سبز پرچم ہوا میں آہستہ آہستہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اندرونی حصے میں ہوٹل قہوہ خانے اور کتابوں کے اسٹال سجے ہوئے تھے اور پنڈال کے مشرقی گوشے میں جہاں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے والنٹیر

ٹھہرے تھے کئی چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے بورڈ لٹک رہے تھے جو اس جلسے کی گود میں سر چھپانے کے لیئے دور دراز سے چلی آئی تھیں۔ پنڈال کے سامنے ابھی ابھی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا ہوئی تھی اس لیئے ہجوم ادھر سے فارغ ہوکر پارک میں پھیل چکا تھا بجلی کی روشنی میں دیس دیس کے لوگوں کے گروہ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ کہیں کہیں جلسے میں طے ہونے والے ہنگامی مسائل پر بحث ہو رہی تھی اور لوگ بڑی بڑی ٹولیوں کی صورت میں اس طرف جھکے ہوئے تھے۔ پارک کے باہر سڑک پر والنٹیرز کا ایک طویل دستہ بینڈ کے ساتھ گذر رہا تھا۔

میں اس وقت بالکل فارغ تھا اور ڈاک گھر کے قریب بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا، رات کی تاریکی میں جلتی ہوئی رنگ برنگ بتیاں ایک سہانے رومان کے تخیل کی طرح ہوا میں لپٹی ہوئی تھیں اور روشنی کی ان حسین لکیروں کے اس پار تاریکی کے دائرے میں اونچے مکان دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ ہوٹلوں میں ریڈیو رنگا رنگ کے نغمے سنا رہے تھے، ریکارڈ بج رہے تھے اور سڑک پر موٹروں کے رکنے اور چلنے کی آوازیں نغموں خبروں اور ہجوم کی باتوں کے شور میں مل کر فضا میں ایک کیکپی سی پیدا کر رہی تھیں، جس جگہ میں کھڑا تھا اس کے قریب ہی چند نوجوان حیدر آبادی شیروانیاں پہنے بڑے انہماک سے ایک شخص کی باتیں سن رہے تھے، جو ایک ماہر داستان گو کی طرح بے تکان بولتا چلا جا رہا تھا۔ اِس کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑی لذیذ

چیز اس کے منہ میں آگئی ہے اور وہ اسے لذت سے مغلوب ہو کر چبا رہا ہے' باتیں کرتے وقت اُس کی سُرخ ٹوپی کا پھندنا بار بار کانپ اُٹھتا تھا جیسے داستان گو کے دماغ سے کوئی بیچین خیال چھلکے سے رینگ کر اس میں گھس گیا ہو' میرا جی چاہا کہ ان کے قریب ہو کر گفتگو کا کچھ حصہ سنوں چنانچہ میں نے کھمبے کا سہارا چھوڑ کر جیب سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر ان کی طرف مڑا ——

"معاف کیجئے گا" اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ شاید پنجاب کے والنٹیر ہیں"

"جی" میں نے اپنے ملاقاتی کو جس کے گورے چہرے پر فرانسیسی تراش کی داڑھی سج رہی تھی دیکھتے ہوئے کہا "کہئے" ——

یہ سُن کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی اور اس نے کہا —— "میں دراصل یہ —— صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ جو ——" مگر ابھی وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ دفعتہً ایک حیدرآبادی نوجوان کی نگاہ اس طرف پڑی اور وہ چیخ کر بولا —— "اماں احسان علی صاحب' ارے بھئی ——

اور احسان علی نے (یہی میرے ملاقاتی کا نام تھا) چونک کر ان کی طرف دیکھا اور فقرہ نا تمام ہی چھوڑ کر ادھر کو ہو لئے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا مگر جب احسان علی صاحب سے ان کے دوستوں نے دن بھر غائب رہنے کی وجہ پوچھی اور انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا کہ وہ جلسے کی سب کمیٹی کی میٹنگ میں مصروف رہنے کے باعث نہیں مل سکے

تو اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں حیدرآبادی نوجوانوں کے درمیان کھڑا ہوں اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرے ساتھی یو۔پی کے ایک بہت بڑے اور مخلص قومی کارکن ہیں۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے کے بعد گفتگو ایک خاص موضوع پر گھوم آئی اور داستان گو کے چبا چبا کر باتیں کرنے کے انداز سے ظاہر ہوگیا کہ وہ پھر اسی ذہنی لذت میں ڈوب گئے ہیں جس کے اثر سے کچھ عرصہ پہلے ان کے سارے اعضا مدہوش ہو رہے تھے۔ اُس کی باتیں مکڑی کے تاروں کی طرح پھیلتی چلی گئیں اور جوں جوں میں کہانی سُنتا گیا مجھے داستان گو سے نفرت ہوتی گئی اور جب اُس نے یہ کہہ کر قصہ ختم کیا کہ بھئی کچھ بھی ہو، ہے مزے کی چیز، تو میرا جی چاہا کہ زور سے اس کے مُنہ پر تھپڑ ماردوں۔ بات دراصل ایک عورت کے متعلق تھی جسے داستان گو صاحب نے صبح اسی پنڈال کے کسی گوشے میں تقریر کرتے سُنا تھا۔ عورت اُن کے بیان کے مطابق خوبصورت بھی تھی اور جوان بھی اور پھر اس کی آواز سن کر یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے آسمانی نغمے اور زمین کے گیت ایک دوسرے میں گھُل گئے ہوں، یہ کہتے ہوئے داستان گو صاحب یکایک کسی ان جانے جذبے کی گدگدی سے کانپ اُٹھے تھے۔

"بھئی احسان علی خدا کی قسم میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس سے مل سکوں مگر وہ عورت تو ٹوٹتا ہوا تارا نکلی"۔ انہوں نے احسان علی سے مخاطب ہو کر کہا "اُدھر اُس نے تقریر ختم کی اور اِدھر ایک کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ میں جب بھیڑ کو چیرتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ تو اس کی موٹر سڑک کا موڑ

گھوم چکی تھی"۔۔۔ اور یہ کہتے ہوئے ان کی ٹوپی کا پھندنا پھر کپکپانے لگا۔۔۔ میں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ آخر وہ اس سے کیوں ملنا چاہتے تھے مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں یہ سوال کرکے ان کے کپڑے اتار لینا چاہتا ہوں اور یکایک داستان گو کی جگہ میری نگاہوں میں پتھر کا ایک عریاں بت ابھر آیا جس کی سنگین سلوٹوں میں ایک کمینہ خیال رینگتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ احسان علی میرے ساتھ کھڑے خاموشی سے تمام واقعہ سنتے رہے۔ اور جب داستان گو ساری باتیں کہہ چکا تو انہوں نے ایک سگریٹ سلگایا اور دوستوں سے کچھ معذرت کرکے مجھے ساتھ لے کر دروازے کی طرف لوٹے۔ میں عموماً زیادہ جان پہچان اور بے تکلفی کو ناپسند کرتا ہوں۔ مگر احسان علی کے ساتھ ملاقات ہی کچھ ایسی حالت میں ہوئی تھی کہ میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آخر وہ میرے سیاسی بھائی تھے اور پھر نہ جانے انہیں مجھ سے کیا کام تھا جو ساتھ لیے جا رہے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کرنا۔۔۔ کتنی بری بات تھی۔ میں کچھ پوچھے بغیر ہی ان کے ساتھ چلتا گیا۔ دروازے سے گذر کر ہم سڑک پر ہو لیے اور آہستہ آہستہ دور نکل گئے۔ احسان علی صاحب چپ چاپ قدم بڑھا رہے تھے۔ جیسے ان کا دل دماغ آنکھیں حتیٰ کہ پاؤں بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ میں اس رفتار سے کچھ پریشان سا ہو گیا "عجیب مصیبت ہے"۔ میں نے دل میں سوچا۔ احسان علی صاحب شاید بھول ہی گئے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اچانک مجھے وہ حیدر آبادی نوجوان یاد آگیا جس نے احسان علی کو بلایا تھا اور میرے سینے

میں کوئی چیخ کر بولا۔ "اماں احسان علی صاحب — ارے بھئی —" اور واقعی احسان علی چونک پڑے — معاف کرنا بھئی۔" اُنہوں نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں تمہیں بھول گیا تھا۔ بالکل بھول گیا تھا۔"
"چلیئے اب یاد آ گیا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں —"

احسان علی مُسکرائے اور کہنے لگے۔ "شاید میں نے کسی صاحب کا پتہ دریافت کیا تھا مگر اب اس کی ضرورت نہیں۔" یہ کہکر وہ خاموش ہو گئے پھر اچانک اُنہوں نے اپنی فرانسیسی تراش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"جس عورت کے متعلق ابھی ذکر ہو رہا تھا تم نے اُسے دیکھا ہے۔"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اس کے متعلق اتنا کچھ سُن لیا ہے کہ اب دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

"احسان علی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پُوچھنے لگے "کیوں"

"اس لئے کہ ممکن ہے وہ سُنی سُنائی بات کے برعکس نکل آئے اور ناحق کوفت ہو۔"

احسان علی صاحب میرے جواب پر بے تحاشا ہنسنے لگے۔ جب ہنسی تھمی تو کہنے لگے۔

"نہیں میرا مطلب کچھ اُور تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں صُبح سے اس کے متعلق بہت کچھ سُن چُکا ہوں۔ یہ عورت بُری بات کی طرح مشہور

ہوگئی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں یونہی اس جلسے میں شرکت کرنے کی بجائے اس عورت کا مطالعہ کرنے آیا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی داستان گو کی بے چینی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ میں نے ان کے چہرے سے ان کے جذبات کا اندازہ لگانا چاہا۔ مگر احسان علی سیاسی کارکن بھی تھے۔ اور داستان گو سے زیادہ سنجیدہ اس لئے میں اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا۔ انہوں نے شاید اس بات کو بھانپ لیا۔ چنانچہ گھڑی دیکھ کر بولے "جلسے کا وقت ہو چکا آؤ واپس چلیں۔ اور ہم چپ چاپ اسی سڑک پر ہولئے۔ جب ہم پارک میں پہنچے تو پنڈال ہجوم سے پُر ہو چکا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی سے جگمگاتی ہوئی ڈائس پر پگڑیوں کے اکڑے ہوئے طرّے اور سرخ اور کالی ٹوپیاں نظر آرہی تھیں اور ان کے درمیان چاندی کی کرسی پر جلسے کے صدر کا منحنی چہرہ نظر آرہا تھا۔ احسان علی میرے پہلو میں کھڑے ڈائس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں لیڈروں کو دیکھنے کی بجائے کسی خلا کو گھورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جلسہ شروع ہوا۔ اور ختم بھی ہو گیا۔ صدر کی انگریزی تقریر کا ایک لفظ سمجھے بغیر نوے فیصدی لوگوں نے نعرے بلند کئے اور وہ کچھ دیر فضا میں کانپ کر ڈوب بھی گئے۔ مگر احسان علی کچھ توجہ کئے بغیر اسی طرح خلا میں گھورتے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہے۔ جلسے کے اختتام پر وہ کچھ چونکے اور ہجوم کے بہاؤ میں سنبھل سنبھل کر باہر نکلے مگر میرا ہاتھ اس مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے کہ مجھے ان کے

اور اپنے حواس پر شک ہونے لگا۔

ہجوم کے نرغے سے نکلتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ "مجھے صبح معلوم ہوا تھا کہ وہ رات کو پھر تقریر کرے گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ —— مگر دیکھنا شاید وہ وہاں ہے۔" اور وہ مجھے کھینچتے ہوئے پنڈال کے مغربی گوشے کو ہو لئے۔ جہاں ایک عورت بہت بڑے ہجوم کے سامنے کھڑی تقریر کر رہی تھی۔ بجلی کے جس کھمبے کے نیچے وہ کھڑی تھی وہ پارک کی اختتامی لکیر پر واقع تھا اور اس کے ساتھ ہی سڑک پر سیاہ رنگ کی ایک کار خاموش کھڑی تھی۔ برقی قمقمے کی تیز روشنی میں اس کا جسم یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ستاروں سے تراشا ہوا ایک بت ہے۔ داستان گو کے قول کے مطابق وہ واقعی حسین تھی اور داستان گو کی یاد آتے ہی اس کے الفاظ سینکڑوں رنگین بجلیوں کی طرح میری نگاہوں میں کوندنے لگے۔ اس کی آواز میں آسمان کے نغموں اور زمین کے گیتوں کی ملاوٹ تھی وہ عورت تھی مگر اس کے انداز دیویوں کے سے تھے۔" یہ کون ہو سکتی ہے" میں احسان علی کو بھول کر سوچنے لگا۔ ستاروں سے تراشا ہوا بت یا آسمانی نغمہ یا زمین کا گیت۔ کیا —— کیا —— اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا چھا رہا ہے۔ یکایک احسان علی نے میرا ہاتھ زور سے کھینچا۔ اور میں چونک پڑا۔ "میں اس سے ملنا چاہتا ہوں" احسان علی نے سرگوشی سے کہا اور مجھے اس کی آواز میں سینکڑوں چیختی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ "میں اس سے

ملنا چاہتا ہوں" - "میں اس سے ملنا چاہتا ہوں"۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ احسان علی اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی میں اس پر پورا غور نہیں کرنے پایا تھا کہ عورت نے اپنی تقریر ختم کر دی اور کھمبے سے ہٹ کر سڑک کی طرف مُڑ ی۔ احسان علی مجھے کھینچ کر تیزی سے اس طرف بڑھے۔ مگر سڑک پر پہنچنے تک کار روانہ ہو چکی تھی اور اس کی سُرخ آنکھ تیزی سے اندھیرے میں غائب ہو رہی تھی۔۔۔

احسان علی نے لڑکھڑا کر میرے کندھوں کا سہارا لیا اور آہستہ سے بڑبڑا کر کہا "چلی گئی"۔ میرے اندر جیسے دفعتہً کسی نے آتش بازی کا انار چھوڑ دیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں چنگاریاں رینگتی ہوئی میری رگ رگ میں سما گئیں۔ اور میں نے مُڑ کر احسان علی سے کہا ۔۔۔

"ہاں چلی گئی۔ لیکن آپ اس کے متعلق اتنا کیوں سوچتے ہیں۔ وہ آپ کی کون ہوتی ہے مجھے بتلائیے۔ کیا ایک عورت کا اپنے خیالات ظاہر کرنا جرم ہے"۔

احسان علی نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے "نہیں"۔

"تو پھر آپ یوں اس کا تعاقب کیوں کر رہے تھے"۔

"میں اس سے ملنا چاہتا تھا"۔

"کیوں؟"

"اس لئے ۔۔۔ اس لئے کہ وہ ۔۔۔" اور وہ فقرہ ناتمام چھوڑ کر جلدی سے ایک طرف چلے گئے۔ میں سڑک پر اکیلا کھڑا تھا۔ پنڈال کی آوازیں خاموش ہو چکی تھیں۔ پرلی طرف دروازے پر جھنڈے کا سبز پرچم ہوا میں آہستہ آہستہ پھڑپھڑا رہا تھا اور مجھے احسان علی ۔۔۔ داستان گو، اور کئی اجنبی چہروں کے عُریاں بُت گھیرے کھڑے تھے ۔۔۔ اور ان کی سنگین سلوٹوں میں چند مکروہ خیال رینگ رہے تھے ۔۔۔

بھوک

آنکھ کھلتے ہی میں نے بھوک کی جلن محسوس کی۔ تاریکی ابھی تک پوری طرح دور نہ ہوئی تھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے کھلی کھڑکی میں سے آسمان ایک دھندلی چادر سے ڈھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا جو آہستہ آہستہ سفید ہوتی جا رہی تھی اور اس کے درمیان ایک ستارہ کانپتا ہوا ڈوب رہا تھا۔ نیچے بازار میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی اور قریب کے مندر میں پوجا کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ فضا میں سوز اس طرح سمایا ہوا تھا کہ طبیعت خود بخود افسردہ ہو رہی تھی۔ میں نے ایک جماہی لی اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کی ناکام کوشش کی۔ بھوک میرے تمام خیالات پر حاوی تھی اور

بن بلائے مہمان کی طرح میری زندگی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ چند دنوں سے یہ معمول ہو چکا تھا کہ آنکھ کھلتے ہی دو سُرخ نقطے میری نگاہوں میں چمچمانے لگتے۔ بھوک ــــ اور روٹی! اور میں نے تنگ آکر کئی بار آرزو کی کہ کبھی آدھی رات کی کوئی خاموش ساعت گُذرتی گذرتی تھم جائے۔ اور تمام دُنیا ہمیشہ کے لیے سوتی کی سوتی رہ جائے۔ تاکہ بیداری اور بھوک کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ مگر یا تو یہ آرزو ہی خام تھی یا اس میں خود غرضی کو دخل تھا۔ بہرحال یہ کبھی پوری نہ ہوئی۔

میرے حالات اب یکسر مخالف رنگ اختیار کر چکے تھے۔ زندگی کا کوئی بلند معیار اس سے پہلے بھی مجھے نصیب نہ تھا۔ مگر اب تو جو کچھ میسر تھا وہ بھی چھن رہا تھا۔ ماں کی موت کے بعد میرے واحد رشتہ دار یعنی چچا نے جو کچھ سلوک میرے ساتھ کیا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں اتنی بڑی دُنیا میں اکیلا ہُوں۔ تنہائی اور بے بسی کے خیال نے چند روز تو بہت تکلیف دی مگر آہستہ آہستہ میں اِس زندگی کا خوگر ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اکثر شدید ہنگاموں کے درمیان میں اپنے آپ کو اکیلا اور افسردہ پاتا ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں شام کے بڑھتے ہُوئے دُھندلکے اور سناٹے میں ایک مہیب چٹان پر کھڑا کسی ساتھی کا انتظار کر رہا ہوں۔ شاید یہ تخیل میرے تنہائی کے شدید احساس کی پیداوار ہے۔ مگر مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ طویل اور ناقابلِ شکست انتظار ہی زندگی کی عروجی لذت ہے۔ اسی خیال نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز بنا دیا تھا۔ اور میں نے اپنے اس اصُول

سے بہت مطمئن تھا کہ کسی شخص کو بھی اپنی زندگی میں داخل ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ مگر تجربے سے یہ اصول کچھ پائیدار ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ آج مجھے کسی ساتھی کی مدد کی بیحد ضرورت تھی میں کسی دوست اور شناسا کے لیے تڑپ رہا تھا مگر جس طرح روٹی میری دسترس سے باہر تھی اسی طرح دوست بھی مجھے دور کسی ان پہنچ خلا میں دھندلی پرچھائیوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور میں کسی طرح بھی اس طویل فاصلے کو جو میرے اور ان کے درمیان حائل تھا دور نہیں کر سکتا تھا۔ روٹی انسان کو ایک دوسرے کے کس قدر قریب کر دیتی ہے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب مجھے روٹی کی تلاش میں انسانوں سے تعلقات رکھنے کی خواہش ہوئی۔

تین دن سے میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ اور آج تو اس کی بھی امید نہیں تھی۔ کیونکہ پچھلے تین دنوں میں میں بھوک سے بچنے کی فکر میں ان تمام جگہوں پر قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ جہاں ذرا سی بھی جان پہچان تھی کئی جگہ تو مجھے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ کیونکہ جونہی میں وہاں پہنچا میرے ملاقاتی نے منہ بنا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ کچھ دیر بیٹھتا اور پھر مصنوعی طور پر کھانستا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور واپس چلا آتا۔

ایک بڑے میاں نے تو حد ہی کر دی۔ جونہی میں نے ان سے اپنی حالت بیان کی۔ انہوں نے اپنی عینک اتار کر جلدی سے اس کے شیشے صاف کیے اور پھر ناک پر جما کر اچھی طرح سے مجھے گھورا اور یکلخت اٹھ کر اندر کو چل دیے

میں سمجھا شاید ابھی آتے ہونگے مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ محض مجھ سے پیچھا چھڑانے کیلئے اندر گئے تھے۔ کیونکہ حضرت کھڑکی کو ذرا سا کھول کر جھانک رہے تھے۔ کہ ابھی میں گیا ہوں یا نہیں ـــــ چنانچہ میں چپکے سے اٹھا اور واپس چلا آیا ـــــ اسی طرح کئی اور جگہ بھی میرے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ مگر چونکہ میرے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے میں نے جدوجہد جاری رکھی۔ حتیٰ کہ تین دن تک میں کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا رہا۔ مگر آج کا دن میرے لئے انتہائی طور پر خوفناک تھا۔ بھوک آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور روٹی حاصل کرنے کی کوئی تجویز میرے ذہن میں نہیں تھی۔ تمام چیزیں جن کو کبھی میں اپنی جائداد کہہ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ ایک ایک کر کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ اُدھر مالک مکان بھی کرائے کا بار بار تقاضا کر رہا تھا۔ پرسوں جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے بہت سی جگہ عرضیاں بھیج رکھی ہیں بس آج کل نوکری ملتے ہی سارا کرایہ چکا دوں گا۔ تو وہ بے اعتباری کی نگاہوں سے گھور کر کہنے لگا۔ برخوردار! ایک مہینے سے تمہاری نوکری کی رٹ سن رہا ہوں مگر یہ آج ملتی ہے نہ کل۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے حال پر رحم کرو اور مکان کسی دوسرے کرایہ دار کے لئے خالی کر دو۔ اس کے عوض ایک مہینے کا کرایہ جو تمہارے ذمہ ہے میری طرف سے بطور نذر قبول کر لو"۔ میں اس کے جواب میں کیا کہتا۔ چنانچہ وہ خود ہی دو دن کی مہلت دے کر بڑبڑاتا ہوا چلتا بنا۔ آج کا دن اس لحاظ سے اور بھی زیادہ خطرناک نظر آ رہا تھا کہ شام ہوتے ہی میں اس مکان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤنگا۔ جو اور نہ سہی میری

عشرت اور بے خانمائی کا پردہ دار ضرور تھا۔

روشنی اب اچھی طرح پھیل چکی تھی اور سرد ہوا کے جھونکوں میں تازگی کی بو آ رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور انگڑائی لے کر کھڑکی کی طرف گیا اور کہنیوں کے بل باہر کو جھک گیا۔ بازار میں ہماہمی شروع ہو چکی تھی۔ اور اس میں کبھی کبھی کسی کسی تانگا گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور موٹر کی چیخ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ سڑک پر گذرنے والے زیادہ تر مزدور تھے جن کے چہرے خواب آلود اور سنجیدہ تھے۔ اور ان کے درمیان کہیں کہیں ایسے چہرے بھی نظر آ رہے تھے جو نئے کپڑے کے ان ٹکڑوں کی طرح تھے جن پر سے تھان کے چھاپے کے کاغذ اتار لئے گئے ہوں۔ دکانوں کی قطار کے پچھلی طرف سیرگاہ میں ہری ہری ڈوب پر پھولوں کے نیلے پیلے تختے دکھائی دے رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ گدلے پانی کا ایک نالہ خاموشی سے بہ رہا تھا۔ نالے کے پل سے گزر کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہرائی میں ڈوب رہے ہیں۔ میں اسی پراسرار نظارے میں گم تھا کہ اچانک نیچے سے روٹی والے کی آواز سنائی دی۔ وہ سائیکل کو دیوار سے لگا کر روٹیوں کا ڈبہ کھولنے مصروف تھا۔ یکایک مکان کا دروازہ کھلا۔ اور میرا ہمسایہ نیم عریاں حالت میں بدن کے گرد لپٹے ہوئے سیاہ دھاگے کو کھینچتا ہوا باہر نکلا اور دو موٹی موٹی روٹیاں اور مکھن لے کر اندر گھس گیا۔ میرے پیٹ میں جیسے کسی نے جلتی ہوئی لکڑی اتار دی۔ بھوک پوری طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئی اور میں کھڑکی سے ہٹا۔ کپڑے پہنے اور باہر نکل

گیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے میں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا تو وہ اس احتیاط کے باوجود کہ میں انہیں اتار کر خالی چارپائی پر تقریباً برہنہ سونے کی مشق کر رہا تھا۔ بے حد میلے ہو رہے تھے۔ ہمسائے کے گھر سے گزرتے ہوئے میں نے جھانک کر دیکھا تو اس کی بیوی روٹی کاٹ کر سینک رہی تھی۔ پانی کے نل پر پہنچ کر میں نے عینک اُتاری۔ مُنہ دھویا اور بالوں کو گیلے ہاتھوں سے جما کر سڑک پر ہو لیا۔ کچھ دیر تک یونہی بلا سوچے سمجھے چلنے کے بعد وہ ہنگامی احساس جس نے مجھے فوراً گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا ختم ہوا اور میں رُک کر سنجیدگی سے سوچنے کی نیت سے ایک باغ میں داخل ہو گیا۔ دھوپ اچھی طرح چمک چکی تھی اور اس کی شعاعیں درختوں اور پتوں سے گزر کر پھولوں اور ملیے سبز پودوں پر گر رہی تھیں۔ باغ کا ایک کونا ایک گھنی بیل کے چوڑے چوڑے پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر درختوں کی لمبی ٹہنیاں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے سایہ زیادہ سرد ہو گیا تھا درختوں کے درمیان ایک چھوٹے سے حوض میں شفاف پانی باہر کو چھلک رہا تھا میں نے جھک کر چند گھونٹ پیئے اور ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ جو ہوا سے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ نیلے آسمان پر گلابی بادل کا ایک ہلکا سا ٹکڑا تیرتا ہوا گزر رہا تھا۔ پھولوں کے درمیان شہد کی مکھیوں کی مسلسل بھنبھناہٹ سُنائی دے رہی تھی اور سڑک پر لوگ خاموشی سے گزر رہے تھے۔

میں نے کچھ سوچنا چاہا۔ مگر خالی پیٹ پانی پینے سے معدے میں حدت بڑھ گئی تھی۔ اور سوچنے کی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اُٹھا اور

باغ سے باہر نکل آیا۔ گیارہ بج چکے تھے اور سڑک پر کاروں کے رکنے اور چلنے کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں تانگوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے پیدل چلنے والے گالیاں دیتے اور بڑبڑاتے بھاگ کر کونوں میں ہٹ رہے تھے —— دکانوں کے اندر جھوٹ اور فریب کی نمائش ہو رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ لوگ ہنستے ہنستے ابھی ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالیں گے۔ بھوک کی وجہ سے میرا دماغ سلگنے لگا۔ مختلف خیالات ذہن میں ابھرتے مگر پھیلنے سے پیشتر ہی دم توڑ دیتے۔ میرے سامنے زندگی لاوے کی صورت رواں تھی۔ جس کے تیز دھارے میں انسان تنکوں کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف بہے جا رہے تھے۔ ان کے بوجھل قدموں کو دیکھ کر آرزوؤں کی چلتی پھرتی قبروں کا گمان ہوتا تھا۔ جب وہ سر اٹھا کر ایک دوسرے کو گھورتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے زمستان کے بھیڑیے بھوک سے تنگ آ کر ٹکٹکی باندھے ہوں۔ میں چلتے چلتے ایک مسجد کے پاس سے گزرا جس کی دیوار کے نیچے ایک فقیر جس کی گھنی داڑھی کسی رنگ کے استعمال سے پیلی ہو رہی تھی بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ حضرت افیمی تھے اور راہ چلتے لوگوں سے پیسے اینٹھنا ان کا پرانا دھندا تھا۔ راہگیروں کو پھانسنے کے لئے وہ ہمیشہ دو فقرے کہا کرتا تھا۔

"کون جا رہا ہے بھئی؟ ——"

"چلے آؤ تمہاری ہی بھلائی کی بات ہے۔"

اور جب اس کی نصیحت کے باوجود کوئی اپنی بھلائی کی بات سننے پر

آمادہ نہ ہوتا تو وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگتا۔ اس وقت ایک بڈھا آدمی ہاتھ میں ڈبل روٹی لیئے اس کی خوشامد کر رہا تھا اور فقیر روٹی لینے کی بجائے اسے موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔

"حرامزادے اُٹھ یہاں سے۔ مجھے تنگ کرتا ہے۔ سوٗر کا بچہ!"

اور وہ حرامزادہ اور سوٗر کا بچہ اس کی گالیوں کو شہد کے گھونٹ سمجھ رہا تھا اور برابر اس کی خوشامد کیئے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ التجا اور خوف کے آثار دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے خُدا کے سامنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اور اس کا افیمی خُدا جس کے گندے کپڑوں کی بدبُو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی اپنی بے نور آنکھیں جھپکاتا ہوُا بڑبڑا رہا تھا۔ اور گالیاں بک رہا تھا۔ میں چپکے سے آگے بڑھ گیا۔ اس مُلک میں ایسے خداؤں کی کمی نہیں جو افیم کھاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ جُوا کھیلتے ہیں اور مزدُوروں سے محنت کی بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور شاید اسی لیئے اس دیس کے باشندے بھُوکوں مرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے خداؤں کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

جب میں سڑک کے موڑ پہ پہنچا۔ تو دو تین ہوٹل نظر آئے جن میں کھانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر میری بھُوک اور بھی چمک اُٹھی ہوا میں گرم گرم روٹیوں کی سوندھی خوشبُو بسی ہوئی تھی۔ اور اس نے مجھے پاگل سا بنا دیا۔ ہوٹلوں کے باہر چار پانچ نحیف النسان میلے اور پھٹے ہوُئے کپڑوں میں لپٹے سر جھکائے کھڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ

اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟ وہ اس طرح زمین کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ ابھی کچھ اُگل دے گی۔ یا پھٹ کر انہیں اپنے آپ میں سمو لے گی۔ مجھے نہ جانے یہ کیوں اچھا لگا کہ وہ زمین سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ ایک آدمی کے پاس پہنچ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمہیں کیا چاہئے"؟ اور اس کا جواب سُن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میرے سینہ میں خنجر بھونک دیا ہو۔

"روٹی ——!" اس نے چونک کر جواب دیا اور جب اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو اُس کے زرد گالوں پر آنسو بہ رہے تھے —— روٹی —— کیا اس مُلک میں روٹی آنسوؤں کے مول بکتی ہے؟ اور کیا سڑکوں اور گلیوں میں رینگتے ہوئے یہ انسان رو رو کر جیتے ہیں۔ میں نے غور سے اس کی ٹھوڑی پر کانپتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہؤا جیسے وہ کسی چیز کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ مگر کیا انسان آنسو بہا کر روٹی حاصل کرنے کے لئے پیدا ہُوا ہے۔ کیا اِس طرح ذلیل ہو کر رہنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے؟ یہ سوچتے ہُوئے میں نے غصہ میں آکر اس سے کہا:۔

"تم روٹی کے لئے روتے ہو نا؟ روؤ اتنے آنسو بہاؤ کہ تمہارا سب کچھ ان میں غرق ہو جائے۔ تم زمین کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہو تم آنسو بہا کر جن سنگ دل خداؤں کا دل نرم کرنا چاہتے ہو وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ کئی صدیوں سے وہ یہاں کا سب کچھ نگل رہے ہیں مگر ان

کی بھوک نہیں مٹتی ۔ اور تمہاری بھی نہیں مٹے گی کیونکہ یہاں کے خدا انسانوں کو بھوکا مار کر زندہ رہنا چاہتے ہیں ۔ اگر تمہیں زندہ رہنا ہے تو آنسو بہانے کی بجائے خدا بن جاؤ ـــــ اور پھر تم بھی روٹیوں کے انبار میں دفن ہو سکتے ہو۔"

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اور میں اسے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے نکل گیا ۔ غصے اور اشتعال کی وجہ سے میری بھوک اور بھی تیز ہو گئی ۔ اور میری آنکھوں میں سیاہ ستارے ناچنے لگے ۔ میں نے سوچا کہ کیا انسان اس قدر ذلیل ہو چکا ہے کہ وہ روٹی کے لئے رونا شروع کر دے ۔ روٹی اور آنسو ـــــ بھوک اور موت ـــــ ! اور مجھے اس احساس نے کچھ ڈھارس دی کہ روٹی کے لئے آنسو بہانے سے مر جانا کہیں بہتر ہے ۔

سڑک سے گزر کر میں ایک وسیع باغ کی طرف ہو لیا اور جب اس میں داخل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قبرستان میں داخل ہو رہا ہوں ۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا ۔ درخت خاموش تھے ۔ سبزہ سویا پڑا تھا اور سرخ و سفید پھول حیرت سے نیلے آسمان کو گھور رہے تھے ۔ میں سنگ مرمر کے ایک بنچ پر گھٹنوں میں سر جھکا کر بیٹھ گیا ۔ بھوک بڑھتی ہی جا رہی تھی اور روٹی ـــــ روٹی کہاں تھی ؟ میں نے آسمان کی طرف دیکھا ۔ نیلا آسمان جس پر سورج چپ چاپ چمک رہا تھا ۔ بے رحمی سے زمین کی طرف گھور رہا تھا ۔ اور زمین خاموش تھی ۔ نہ آسمان سے کچھ برسنے کی توقع تھی ۔ نہ زمین سے کچھ اُگلنے کی ۔ اور بھوک ـــــ میری آنکھوں میں پھر ستارے ناچنے لگے ۔ سیاہ ستارے جو آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے ۔ رقص

کرتے اور تڑپتے اور ان کے ساتھ ساتھ ایک تیز جلن میرے سارے جسم میں پیدا ہو رہی تھی۔ یکایک ستاروں کا ناچ تیز ہو گیا۔ سیاہ ستارے شراروں کے پھول بن کر چمکنے لگے۔ اور دفعتہً ان میں سے ایک پھول ٹوٹ کر میری طرف بڑھا اور اس میں مجھے ایک عجیب و غریب چہرہ نظر آیا اور میں چیخ اُٹھا ——

"جیسس کرائسٹ!"

اور میری اونگھ ٹوٹ گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو ایک عجیب قسم کا آدمی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ لمبے لمبے سنہرے بال چھوٹی سی زرد داڑھی اور پیلا چہرہ جس پہ ناک اونٹ کے کوہان کی طرح اُبھری ہوئی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں میں زیادہ پان چبانے کی وجہ سے سیاہ سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جن کے نیچے بھورے دانت جھلک رہے تھے۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کیا بڑبڑا رہے تھے بھئی؟" اس نے اس خلوص سے کہا کہ میرا جی چاہا اس سے کچھ نہ چھپاؤں۔

"میں سوچ رہا تھا کہ روٹی کہاں سے مل سکے گی۔ کل رات سے میں بھوکا ہوں۔"

"ہیں" اسے یقین نہ آیا۔ "کل رات سے بھوکے ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا اور اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل وہ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ نحیف بدن لمبی ناک، اور بالوں کے ساتھ چھوٹی سی داڑھی۔ واللہ عجب مضحکہ خیز آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ مگر

اس کے لہجہ میں خلوص کی بُو آ رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں لے گیا ـــــ اس کی چال میں ہلکا سا لنگڑا پن تھا مگر اس میں اتنا حُسن تھا کہ کئی بار میرا جی چاہا کہ میں بھی اسی طرح چلنے لگوں۔ قہوہ خانے میں خاموشی طاری تھی۔ دفعتہً روٹیوں کی سُوندھی خوشبو ہوا میں پھیل گئی اور ایک لمحے کے لئے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی ـــــ "روٹی" ـــــ میں نے آہستہ سے کہا اور میز پر جھک گیا۔ جب تک میں کھاتا رہا وہ خاموشی سے ایک طرف گھورتا رہا۔ شکل وصورت کی طرح اس کی حرکتیں بھی عجیب تھیں۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو کسی چیز کی بھوک معلوم ہوتی تھی۔ جب میں روٹی کھا چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مزدوروں کا ایک لیڈر ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دن بھر مزدوروں میں کام کرتا ہے اور رات کو شعر کہتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے چند شعر بھی سُنائے میں بڑے انہماک سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو جوش کی وجہ سے اسفنج کی طرح سُکڑ رہا تھا۔

"میں مزدوروں کا رہنما ہوں"۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور مزدور، مظلوم اور جاہل ہوتے ہیں۔ میں انہیں اپنے حقوق کے لئے سرمایہ داروں سے لڑنا سکھاتا ہوں۔ اس شہر کے تمام تانگہ ڈرائیور اور مزدور میری بات مانتے ہیں اور میں ان کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہوں۔"

میرے دِل میں معاً اس کے لئے تقدس پیدا ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے مضحکہ خیز جسم کے اندر ایک حسین انقلابی روح تڑپ رہی ہے ـــــ اور وُہ سنہری روح ہی تو تھی جو اس کے اندر سے بول رہی تھی اور اس کے مُنہ سے کہلوا رہی تھی کہ ـــــ "میں سرمایہ داروں کا دشمن ہُوں وہ مجھے کبھی نہیں خرید سکتے۔ مزدوروں کے لئے میری جان حاضر ہے اور یہ سرمایہ دار، یہ ظالم کتے، میں اُن کے مُنہ پر تھوکتا ہُوں۔ یہ جو زمین کی گندگی ہیں۔ زندگی کا کوڑھ ہیں اور انسانیت کے جسم پر بدنُما داغ ہیں۔ یہ لوگ ہمیں بھوکوں مارنا چاہتے ہیں۔ ہماری لاشیں پھاڑنا چاہتے ہیں ہماری ہڈیاں نوچنا چاہتے ہیں۔ یہ گدھ۔ وحشی کتے ـــــ"

یہ کہتے ہوئے اس کی کنپٹیاں پھڑکنے لگیں اور ماتھے کی چھوٹی چھوٹی نسیں اُبھر آئیں۔ میں نے اس سے کچھ کہنا چاہا مگر اتنی باتیں یکلخت میرے ذہن میں اُبھر آئیں کہ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے مزدوروں کے لیڈر کی قیمتی شیروانی۔ طلائی گھڑی اور نئے جوتے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے پُوچھنا چاہتا تھا کہ دراصل اس کا پیشہ کیا ہے۔ کیا وہ قیمتی شیروانی طلائی گھڑی اور نئے جوتے خریدنے کے لئے مزدوروں کی لیڈری کے علاوہ کوئی اور دھندا بھی کرتا ہے مگر جیسا کہ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا وہ صرف لیڈر تھا۔ تو پھر یہ قیمتی شیروانی۔ طلائی گھڑی اور نئے جوتے ـــــ؟ اور میری نگاہوں میں معاً سینکڑوں مزدوروں کے نحیف جسم نمودار ہو گئے جو پھٹے ہوئے کپڑے پہنے نیم برہنہ حالت میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

ابھی میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ ایک تیسرا آدمی چپکے سے قہوہ خانے میں داخل ہؤا اور اسے دیکھ کر میرے ساتھی کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو گئی ——

"کیا خبر لائے بھئی؟" اس نے اجنبی کی طرف متوجہ ہو کر کہا اور مجھے اس کی آواز میں شدید بھوک کا احساس ہؤا۔

اجنبی نے گھُور کر میری طرف دیکھا اور پھر آگے جُھک کر اتنی آہستگی سے جسے میں بڑی مشکل سے سُن سکا۔ مزدوروں کے لیڈر سے کہا۔ "مل کا مالک رحمت علی کی موت کا معاملہ دبانے کے لئے تین ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہے میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہُوں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ مزدوروں کی یونین اس معاملے میں کوئی حصہ نہ لے اور اس نے چند مزدور بھی تیار کر لئے ہیں جو یہ گواہی دیں گے کہ رحمت علی سیٹھ کے دھکے سے نہیں بلکہ اتفاقاً مشین کی جھپیٹ میں آ گیا تھا۔"

"مگر تین ہزار تو بہت تھوڑے ہیں۔ کیا وہ بدمعاش ہمیں اُلو بنانا چاہتا ہے؟" میرے ساتھی نے سرگوشی میں کہا۔ "جاؤ اسے کہو کہ یہ مزدور کی موت کا معاملہ ہے۔ وہ اتنا سستا نہیں چھوٹ سکتا۔ ہم پانچ ہزار سے ایک کوڑی کم نہ لیں گے ——"

آخری الفاظ کہتے وقت اسے شاید اس بات کا احساس ہؤا کہ میں نے اس کی بات سُن لی ہے چنانچہ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر ہنسنے کی کوشش کی۔

"خی۔ خی۔ خی" وہ ہنسا

مگر اس کی ہنسی اس ڈالل کی سی تھی جو اپنے شرمناک پیشے پر خفیف ہو رہا ہو۔ میں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا چھوٹا سا منہ ایک بھیانک مشین ہے جس میں مزدوروں کی لاشوں سے ہڈیاں اور گوشت الگ کیا جا رہا ہو۔ وہ شاید بیوپاری تھا مزدوروں کے گوشت اور ہڈیوں کا بیوپاری۔ اور اس بھیانک بیوپار کے عوض وہ اپنی روٹی کماتا تھا۔ روٹی ــــ اس ملک میں روٹی آنسوؤں کے مول بکتی ہے اس ملک میں روٹی گوشت اور ہڈیوں کے مول بکتی ہے۔ یہاں بیوپاری اور خدا بستے ہیں۔ اور انسان ــــ انسان کہاں ہے؟ ــــ روٹی کہاں ہے؟

یکایک میری نگاہوں میں کئی سیاہ ستارے ٹوٹ پڑے۔ قہوہ خانے کے بھیانک سناٹے میں مزدور لیڈر اور فقیروں کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو گھورنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بھوک آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

جنازہ

اچانک برآمدے میں زمین پر لکڑی کے گھسٹنے کی آواز آئی اور پھول سنگھ بیساکھیاں ٹیکتا ہوا کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا مجھے دیکھ کر وہ حسبِ معمول اپنے قابلِ رحم انداز میں مسکرایا اور اپنی میز کے قریب پہنچکر بیساکھیاں بغل سے نکالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کمرے میں ایک کی بجائے دو آدمی ہو گئے۔ ایک مَیں اور ایک پھول سنگھ۔ جس کی ایک ٹانگ کوئٹے کے زلزلے میں کٹ گئی تھی۔ اور دروازے کے عین اوپر لگی ہوئی گھڑی کی خاموشی سے گھومتی ہوئی باہیں ظاہر کر رہی تھیں کہ ابھی پندرہ بیس منٹ تک ہم دونوں اکیلے اس جگہ بیٹھے ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہیں گے۔ میں نے حسبِ معمول جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگایا اور ایک کرسی پر ٹانگیں

پھیلا کر بڑے اطمینان سے پینے لگا۔ دھوئیں کی نیلی چادر کے درمیان میں
میں نے دیکھا کہ پھول سنگھ نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنے کے لئے لب ہلائے
مگر کوئی آواز سنائی نہ دی اور کمرے کی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ اس کمرے
میں دن کے سات گھنٹے چوبیس آدمی کام کیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود
یہاں ایک عجیب قسم کی خاموشی چھائی رہتی تھی جیسے کائنات کا سارا حسن
برباد ہو چکا ہو اور یہ کمرہ اس کے انجام پر آنسو بہا رہا ہو۔ صبح دس بجے
جب وہ اپنی اپنی میزوں پر آ کر بیٹھتے تو ان کے چہروں پر ہلکی سی تازگی ہوتی۔
مگر جوں جوں دن ڈھلنے لگتا ان کی شکلیں دھندلی پڑنے لگتیں اور وہ
کمرے میں یوں گھومنے لگتے جیسے کسی کھوئی ہوئی شے کا ماتم کر رہے ہوں
مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ مگر اس کمرے کی
خاموشی اور تاریکی کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس
وسیع دنیا میں کہیں بھی ہما ہمی اور روشنی کا وجود نہیں اور میں صدیوں سے
ایک ایسے آسمان کے نیچے سانس لے رہا ہوں جس پر صرف سیاہ ستارے
ہی جگمگاتے ہیں۔ جب سے میں نے یہ زندگی اختیار کی تھی یہ میری عادت
ہو گئی تھی کہ صبح کام شروع ہونے سے پندرہ بیس منٹ پیشتر ہی میں دفتر
پہنچ جاتا اور اکیلے کمرے میں خاموشی سے بیٹھا سگریٹ سلگا کر کچھ نہ کچھ سوچا
رہتا۔ سورج کی دھندلی کرنیں کھڑکیوں کے گرد آلود شیشوں سے جھانکنے
کی کوشش کرتیں اور مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ کمرے کے ایک
دروازے سے سبز گھاس سے بھرے ہوئے ایک وسیع میدان کے کنارے

پر لاتعداد گھنے درخت ہوا کے سرد جھونکوں سے مسرت بھری جھرجھریاں لیتے دکھائی دیتے اور اِن کے قریب ریلوے کے ایک شیڈ سے کبھی کبھی کوئی انجن چیختا ہوا نکلتا اور پٹڑیوں پر دوڑتا ہوا کسی نامعلوم سمت کی طرف چل دیتا۔ ریل کی پٹڑیوں کے درمیان سگنل کے لال بازو جب انجن کے سیاہ دھوئیں کو چیر کر اُبھرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے مقصد کے لئے قربان ہونے پر تلے ہوئے ہیں۔

عموماً دس بجنے سے پانچ منٹ پیشتر تک کوئی شخص میری تنہائی میں مخل نہ ہوتا۔ مگر کبھی کبھی پھول سنگھ کی بیساکھیوں کا شور اچانک کمرے میں اُبھر آتا۔ اور مجھے پریشان کر دیتا۔ چنانچہ ایک دن تو میں اس سے اتنا بیزار ہوا کہ میرا جی چاہا کہ پھول سنگھ کی بیساکھیاں چھین کر اپنی بغل میں لے لوں اور انہیں ٹیکتا ہوا اس کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جاؤں۔ وہ ایک عجیب سا آدمی تھا۔ اور اسے پہلی مرتبہ دیکھتے ہی میری ہمدردی جاگ اُٹھی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش دیکھ کر ہمیشہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کسی وجہ سے یہ جنبش اور اس کی آنکھوں کا بیکراں سوز مل کر ایک ایسی قابلِ رحم مسکراہٹ کی شکل اختیار کر لیتے تھے کہ میرا دل اس کے نظارے سے ڈوبنے لگتا تھا۔ وہ مجھے دفتر کے دوسرے آدمیوں کی طرح شاعر کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے میرے ساتھ بڑی احتیاط اور احترام سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ کرسی پر بیٹھا خاموشی سے اپنی بیساکھیوں کو گھور رہا تھا۔ اور میں انتہائی

کوشش کے باوجود اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کے متعلق غور کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اور شاید مجھے کچھ دیر کے لیئے اس ذہنی تکلیف کو برداشت کرنا پڑتا۔ مگر دفعتہً برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور مجھے احساس ہو گیا کہ اب میری رہی سہی مسرت بھی برباد ہو گئی۔ کمرے میں پہلے ایک آدمی داخل ہوا۔ پھر دوسرا اور آہستہ آہستہ کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔

چوبیس آدمیوں سے جن کے لئے گھڑی کے سیاہ بازو دس بجے لیکر پانچ بجے تک چاندی کا روپ اختیار کرکے گھومتے رہتے تھے میرے لئے اب اس کمرے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جب تک میں اکیلا تھا کمرے کی تنہائی میں چند ایسے سائے گھوم رہے تھے جو میری سوچ کے غلام تھے اور میری مرضی کے مطابق چل پھر رہے تھے مگر اب ان کی جگہ ایسی پرچھائیوں نے لے لی تھی جن پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ پرچھائیاں گنتی میں چوبیس تھیں اور سب میں بیگانگی اور اجنبیت موجود تھی۔ عام طور پر چوبیس آدمی خاموشی سے کام کرتے رہتے تھے اور چند رسمی باتوں کے علاوہ اور کسی قسم کی گفتگو کا موقعہ نہیں آتا تھا۔ مگر جب کبھی یکایک باتوں کا سلسلہ چل نکلتا تو اس جوش و خروش کا مظاہرہ ہوتا کہ بعض آدمیوں کے چہرے سرخ ہو جاتے اور یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کئی پتھروں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں ۔ اس وقت مجھے احساس ہوتا کہ ابھی اس جگہ زندگی اپنی ساری محبت اور نفرت کے ساتھ موجود ہے۔ اور ان آدمیوں کی آوازوں میں اس کے تاروں سے نو بہ نو نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے

جب میں اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتا تو اپنے مکینوں کے لحاظ سے یہ کمرہ مجھے ایک ایسی چھوٹی سی دنیا معلوم ہونے لگتا جس میں اس وسیع دنیا کی ساری اچھی اور بری قوتیں مصروف عمل تھیں۔ اس ننھے سے جہان میں ہیڈ ننٹ نول کشن ورما جو ایک ہی وقت میں کلرک۔ راج وید۔ برہمن اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھے عمر رسیدہ کلرکوں کے نمائندہ تھے اور اس فرض کو پورے طریقہ سے انجام دینے کے لیے شیخ امجد حسین جن کی مذہبی معلومات کا بڑا شہرہ تھا ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں دفتر کی نوجوان ٹولی میں مرزا انور بیگ جن کے قیمتی کپڑوں اور اعلیٰ درجے کا تمباکو استعمال کرنے کی وجہ سے انہیں "راجہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اپنی نازک عینک کے سنہری فریم کو سنبھال کر باتیں کرنے میں بہت مشہور تھے ادھیڑ عمر کلرکوں میں ایک لمبے قد اور سرخ آنکھوں والا آدمی جس کے سر کے بال تقریباً اڑ چکے تھے اور ایک دبلا پتلا کلرک جو ہمیشہ ایک ہی شیروانی پہنے اور سیاہ فریم کی عینک لگائے دفتر میں گھومتا نظر آتا تھا زیادہ بحث کے عادی ہونے کی وجہ سے بہت بدنام تھے۔ ان سب میں زندگی کی کوئی نہ کوئی چنگاری سلگ رہی تھی اور وہ کبھی نہ کبھی اس کی نمائش کا موقعہ تلاش کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس خواہش نے ان میں ایک دوسرے کو بری نظر سے دیکھنے کی خطرناک کمزوری پیدا کر دی تھی۔ اور اس کے زیر اثر وہ یا تو بالکل خاموش رہتے تھے۔ یا ایک دوسرے کے خلاف اس قدر نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کرتے تھے کہ ان کے دلوں سے دھواں

اُٹھتا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی اس کمرے کے چوبیس آدمیوں میں سے کئی ایسے تھے جن کے چہروں سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے ہوائے زندگی کی خنکی تپش اور نمی برداشت کی ہے۔ مگر ان کے لبوں پہ مہرِ سکوت تھی اور وُہ کسی وجہ سے اپنے احساسات کے اظہار سے معذور تھے۔ مگر کبھی کبھی وہ میرے پاس آکر شاید اس لئے کہ وُہ مجھے شاعر سمجھتے تھے اپنے سینے میں چھپی ہوئی آگ کی ایک آدھ چنگاری میرے سامنے پھینک دیتے تھے اور اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی بڑا تجربہ اور راز بیان کرنے کے بعد بڑے فخر کے ساتھ میرے سامنے ایک نیا فلسفۂ زندگی پیش کرتے تھے۔ مگر عموماً مجھے اس فلسفے میں ایک ہی رنگ نظر آتا تھا اور ان کی باتیں سُنتے سُنتے مجھے اچانک ایک ایسی بُو آنے لگتی تھی جو قبرستان میں آخری وقت کفن کھول کر مُردے کا مُنہ دیکھتے وقت آیا کرتی ہے۔

اب دس بج چُکے تھے اور چوبیس آدمی خاموشی سے میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کی لمبی میز کے پاس بیٹھا ہوا ہیڈ کلرک اپنی دُھندلی آنکھیں کاغذوں کے بھاری پلندے پر گاڑے کچھ پڑھنے میں مشغول تھا اس کے پچھلی طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں سے ہلکی ہلکی کھانسی کی آواز ظاہر کر رہی تھی کہ اس دفتر کے چوبیس آدمیوں کا غیر ملکی آقا مسٹر ایس۔ یو۔ گرینی "جہاز مارکہ" سگرٹ پی رہا ہے۔ اور اس کے دروازے پر پڑی ہوئی چق کے آگے دفتر کا کانا چپڑاسی بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ ان تمام باتوں کا بظاہر یہ مطلب تھا کہ دفتر کا کام شروع ہو چکا ہے۔ مگر ہر آدمی اپنی اپنی

جگہ بیٹھا یہ محسوس کر رہا تھا کہ جب تک مس گریش آکر ٹائپ رائٹر نہیں سنبھالے گی دفتر ادھورا اور سونا پڑا رہے گا۔

مس گریش اس دفتر کی سانولی اور دبلی پتلی ٹائپسٹ تھی جسے پہلی نظر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مجسمہ ساز کی دکان کے باہر رکھا ہوا نمونے کا بت ہے۔

اس جگہ وہ تین مہینے سے کام کر رہی تھی اور دو مہینے ہوئے اس نے ایک سارجنٹ سے شادی بھی کر لی تھی۔ مگر اس جگہ وہ ابھی مس گریش کے کنوارے نام ہی سے پکاری جاتی تھی کیونکہ "مسز ولیم" کا خطاب شاید کہنے والوں اور سننے والی دونوں کو ناپسند تھا۔ مس گریش کا وجود اس لحاظ سے بہت ہی اہم تھا کہ اور کسی بات پر چوبیس آدمی متفق ہوں یا نہ ہوں مگر مس گریش کے معاملے میں ان کی رائے ہمیشہ ایک ہی ہوتی تھی۔ اس کے سامنے وہ اپنی ساری نفرت اور حقارت بھول جاتے تھے اور ایک ہی طریقے سے سوچنے لگتے تھے۔

جب وہ پہلے پہل اس دفتر میں آئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا وجود میرے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس کی بات چیت میرے ساتھ ہی شروع ہوئی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے کی فکر میں ہوں۔ مگر تھوڑی ہی مدت میں میں نے انہیں سمجھا دیا کہ مس گریش مجھ سے محض اس لئے دوستی رکھنا چاہتی ہے کہ میں ایک افسانہ نگار ہوں اور میں اس سے اس لئے گفتگو کرتا ہوں کہ

ادروں کی طرح اس کے دل کی گہرائی میں چھپے ہوئے اسرار بھی معلوم کروں اور دیکھوں کہ اس کے ننھے سے سینے میں کتنی عظیم آرزوئیں کے سنہری مینار چمک رہے ہیں۔ ممکن ہے اس صفائی کے بعد بھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ مگر مس گریش کی شادی نے ساری غلط فہمی دور کردی اور جب وہ شادی کے بعد بھی مجھے اسی طرح ملتی رہی تو جذبۂ محبت کا احساس بالکل ہی برباد ہوگیا۔

اس کی شادی کی خبر دفتر کے بہت سے کلرکوں کے لئے پیام موت سے بھی بدتر تھی کیونکہ مس گریش کی آمد سے ان کی زندگی میں جیسے بہار آگئی تھی مجھے مس گریش کا منظورِ نظر سمجھ کر اکثر وہ میرے پاس آبیٹھتے تھے اور اشاروں ہی اشاروں میں دل کی بات اس طرح کہتے تھے کہ مجھے ان کا وجود سراپا آرزو معلوم ہونے لگتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ محسوس ہونے لگتا کہ گریش ایک رسیلا پھول ہے اور یہ بھونرے اس کے آس پاس اس لئے منڈلا رہے ہیں کہ اس جانِ بہار کا سارا رس چوس لینے کے بعد کسی نامعلوم دیس کی طرف اُڑ جائیں۔

گریش شاید ان کے دل کی بات بھانپ گئی تھی چنانچہ ایک دن اس نے چپکے سے اپنی شادی کا اعلان کردیا اور اس دن اس کے چاہنے والوں نے محسوس کیا کہ اچانک خزاں نے ان کی ساری تازگی اور رعنائی چھین لی ہے اور گریش اب ان کے لئے رسیلے پھول کی بجائے ایک زہریلی شراب کا پیالہ بن گئی ہے جسے وہ کبھی اپنے ہونٹوں سے نہیں چھو سکتے۔

اس واقعے کے بعد کلرکوں کی محبت نے ایکا ایکی نفرت کی نقاب اوڑھ لی اور وہ مس گریش کا مذاق اُڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ جب وہ دفتر میں آتی تو دو تین منچلے جن میں ایک جو ہر وقت ورزش کی فکر میں رہنے کے باوجود سب سے زیادہ نحیف اور کمزور اور دُوسرا کھانسی کا مستقل مریض تھا اُسے مندرجہ ذیل فقرے کہتے۔

"ہیلو مس گریش کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے۔" وہ مسکرا کر جواب دیتی۔

"اور ولیم صاحب کیسا ہے؟"

"وہ بھی اچھا ہے۔ کیوں! اس کا کیوں پُوچھتے ہو۔" مس گریش کی تیوری چڑھ جاتی۔

"واہ کیوں وہ آپ کا خاوند جو ہے۔"

"شٹ اَپ یو سواین۔" یک لخت مس گریش تلملا اُٹھتی۔

اس فقرے سے خدا جانے مس گریش کو کیا چڑ تھی کہ وہ فوراً غصے سے سیاہ پڑ جاتی اور سب کلرک مسکرانے لگتے۔ پہلے پہل تو میں اس معاملے میں خود اندھیرے میں رہا۔ مگر ایک دِن مس گریش نے مجھے خود ہی بتا دیا کہ ولیم سے اس کا ہمیشہ جھگڑا رہتا ہے اِس لئے وہ اس کے ذکر کو بھی ناپسند کرتی ہے۔ "رات کو جب میں دیر سے گھر جاتی ہُوں تو وہ مجھے پیٹتا بھی ہے" اس نے افسُردگی سے مجھے بتایا۔ شادی سے پہلے وُہ بہت اچھا تھا مگر اب وہ پتہ نہیں کیوں بگڑ گیا ہے۔"

اس کی باتیں سُن کر میں نے ہمدردی کے چند الفاظ کہے۔ مگر وہ بہت مایوس معلوم ہوتی تھی۔ اور میں خود حیران تھا کہ کلرکوں کو ان کی اَن بَن کا کیسے پتہ چل گیا۔ چنانچہ وہ اکثر اس کے متعلق اس طرح باتیں کرتے:۔

"یہ سانی خاوند کے نام سے اتنا چڑتی کیوں ہے؟" ایک آہستہ سے دُوسروں کے سامنے سوال پیش کرتا۔

"بھئی! بات یہ ہے کہ ولیم سے اس کی بنتی نہ ہوگی ——" دوسرا جواب دیتا۔

"میرے خیال میں تو یہ بدمعاش ولیم صاحب کو سمجھتی ہی کچھ نہیں۔" شیخ صاحب کی آواز آتی۔

میں کہتا ہوں بھئی! یہ ولیم صاحب تو ایک آڑ ہی ہیں۔ اس پردے میں بھگوان جانے کون کون خوش قسمت مزے اُڑاتے ہوں گے۔" پنڈت نول کشن ورما ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتے۔

"تو پھر یہ بات پکی ہے کہ ولیم اوّل درجے کا اُلّو کا پٹھا ہے۔" مرزا انور بیگ اپنی عینک کا سُنہری فریم سنبھال کر کہتے اور سب کے سب کلرک ہنسنے لگتے۔

مس گریش انہیں ہنستے دیکھتی تو اور بھی جل جاتی اور یا تو مشین چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھتی یا ٹائپ کئے ہُوئے کاغذ سنبھال کر دُوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ اس کے اندر جاتے ہی معلوم نہیں مسٹر ایس۔ یو۔ گرینی منہ میں تولیہ ٹھونس لیتے یا "جہاز مارکہ" سگریٹ پینے بند کردیتے بہرحال ان

کی ہلکی ہلکی کھانسی بند ہو جاتی اور دفتر میں خاموشی سی چھا جاتی۔ کچھ دیر بعد جب وہ چق اُٹھا کر باہر نکلتی تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی۔ دفتر کے دو چار کلرکوں کے لئے اس کی ہنسی تو زہر تھی جو اندر ہی اندر ان کی رُوح کو چاٹ رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا تھا جو اب اسے اوّل درجے کی بدمعاش اور حرامزادی سمجھنے لگے تھے۔

چوبیس آدمیوں میں صرف دو آدمی ایسے تھے جو ان کی اس رائے سے متفق نہ تھے۔ ایک میں جسے ساری باتوں کا پتہ تھا اور دُوسرا پھول سنگھ جو خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھا رہتا اور دفتر کے کسی معاملے میں حصّہ نہ لیتا تھا۔ پھول سنگھ گریش کے عین سامنے بیٹھتا تھا مگر اس معاملے میں بھی اس کی دلچسپی اسی قابلِ رحم مسکراہٹ تک محدود تھی جو اس کے چہرے پر ہمیشہ نظر آیا کرتی تھی۔ فقط ایک بار میں نے دیکھا تھا کہ وہ مس گریش کی طرف دیکھ رہا ہے مگر اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وُہ پھول سنگھ نہیں بلکہ سراپا سوز ہے اور اگر گریش نے آنکھ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیا تو فوراً ایک آنسو بن جائے گی۔ ایک متحرک آنسو جو اس دفتر کی دیوار میں ابد تک کپکپاتا رہے گا۔

گھڑی کے بازو اب ساڑھے دس پر پہنچ چکے تھے۔ مگر مس گریش ابھی تک نہیں آئی تھی۔ دفتر میں اس کی عدم موجودگی پر رائے زنی شروع ہو گئی تھی اور مسٹر ایس۔ یو۔ گرینی بھی ہیڈ کلرک کو دو بار بلا کر پوچھ چکے تھے کہ

ابھی تک مس گریش کیوں نہیں آئی۔ ہیڈ کلرک نے دونوں بار کمرے سے نکل کر اپنی عینک کے دھندلے شیشے صاف کئے اور کلرکوں سے اس بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ادھر ایک کونے میں پنڈت نول کشن ورما شیخ امجد حسین اور مرزا انور بیگ میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

"کیوں بھئی! آج یہ کہاں رہ گئی ــــ" شیخ نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا "کون گریش؟ واقعی یہ سوچنے کی بات ہے۔ کہیں راستے میں ٹکرا کر ہی نہ ہو گئی ہو۔ سالی سائیکل بھی تو بے تحاشا ہی چلاتی ہے۔" مرزا انور بیگ عینک کے فریم پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"ارے بھئی راجہ ــــ! کہیں کسی کے ساتھ نکل ہی نہ گئی ہو۔ ان چھوکریوں کا اعتبار ہی کیا ہے۔ جہاں ذرا بانکا ترچھا آدمی دیکھا بس جھٹ سے چپک پڑیں۔ پنڈت نول کشن ورما نے مرزا انور بیگ سے مخاطب ہو کر کہا اور تینوں اچانک چپ ہو گئے جیسے وہ یہی بات سننے کے منتظر تھے اور جب وہ کہہ ڈالی گئی تو اب وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیوں کہی گئی۔

دفتر کی دوسری میزوں پر کلرک حسبِ معمول سر جھکائے لکھنے میں مشغول تھے۔ جیسے ان کے لئے مس گریش کی عدم موجودگی ایک پنسل کے گم ہو جانے سے زیادہ اہم نہ تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر مس گریش تھی ہی کیا۔ ایک معمولی ٹائپسٹ اور ایک ٹائپسٹ کے نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ہسٹریا ہیں۔ یوگرینی بھی کھانستے کھانستے

دم توڑ دیں تو دفتر کا کام بند نہ ہو۔ دفتر ایک ایسی دُنیا ہے جس کے آسمان سے سرد مہری اور اجنبیت کی کرنیں ہی پھوٹتی ہیں۔ اور رینگتی ہوئی اپنے سائے میں بسنے والے آدمیوں کی رگ رگ میں سما جاتی ہیں اور ان میں خود غرضی اور مکاری کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ ہمدردی اور محبت چمن زندگی کے دو ایسے پھول ہیں جن سے جاودانی مسرت کی مہک پھیلتی ہے مگر اس زمین کی سوزناک خاک میں نفرت و حقارت کے جلے ہوئے پھول اُگتے ہیں اور انسان اُن گدھوں کی طرح ایک دُوسرے کی زندگی پر تاک لگائے رہتے ہیں جو ایک صحرا میں بھٹکتے ہوئے کارواں کے پیچھے پیچھے اس امید سے چکر کاٹتے ہوئے بڑھتے ہیں کہ کب آدمی نڈھال ہو کر گریں اور وہ ان کی لاشوں پر جھپٹ پڑیں۔ مس گریش نہیں آئی نہ سہی۔ کل کوئی اور گریش آجائے گی اور اس کا کام سنبھال لے گی۔ ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ اپنی میز پر بیٹھا ہیڈ کلرک بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ کیونکہ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں زیادہ گہری ہوتی چلی جا رہی تھیں اچانک ایس۔ یو۔ گرینچ کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے آواز دی۔

”کمل رائے!“

ہیڈ کلرک اپنی عینک کو سنبھال کر اندر بھاگا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس نے ایک ایسی سُنائی کہ سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

"مس گریش ہسپتال میں ہے"۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "رات سارجنٹ ولیم سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مار مار کے ہڈیاں توڑ دیں"۔

"ہڈیاں توڑ دیں"۔۔۔۔۔ پنڈت نول کشن حیرانی سے بولے۔

"ہاں بھئی! ہسپتال والوں نے فون میں کہا ہے کہ اسے کافی زخم آئے ہیں۔ گو وہ خطرے سے باہر ہے پھر بھی ایک مہینے سے پہلے اچھی نہ ہو سکیگی" ہیڈ کلرک نے مظلومی سے کہا۔

"اوہ" مرزا انور بیگ نے جیسے درد محسوس کیا۔ "کس قدر تکلیف میں ہوگی بیچاری"۔

"حرامزادہ بے درد" شیخ امجد حسین نے سارجنٹ ولیم کو ماں کی گالی دے کر کہا۔ "مجھے مل جائے تو کچا ہی چبا جاؤں"۔

اور مجھے ان کی باتیں سُنکر یوں محسوس ہوُا جیسے ان کے سینے یکایک محبت سے بھرپور ہو گئے ہیں اور اس اُجڑی ہوئی کائنات میں نزانۂ مسرت اپنی تمامتر میٹھی راگنیوں کے ساتھ اُبھر آیا ہے وہی آدمی جو کل تک گریش کو تنگ کرنے اور اس کا مذاق اُڑانے کی فکر میں رہتے تھے اب اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے اور میں اپنی کرسی پر بیٹھا انسان کے تلوّن پر غور کر رہا تھا گریش کے اس حادثے نے مجھ پر ایک اور ہی کیفیت طاری کر دی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر زخم اور دُکھ ہی محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں تو زمین ابھی تک اس سے کیوں محروم ہے۔ اس وسیع دُنیا میں ہر طرف زخموں کی نمود ہے۔ انسانیت کے سینے پر ظلم۔ جبر اور افلاس کے ناسُور

رہی ہے ہیں۔ انسان کا دل محکومی۔ حقارت اور خود غرضی کے تیروں سے خون ہو چکا ہے پھر —— پھر ہر طرف دھواں اور تاریکی کیوں ہے۔ وہ کونسی مبارک ساعت ہو گی جب انسان زندگی کے آئینے میں اپنا بھیانک چہرہ دیکھ کر کانپ اٹھے گا اور ایک ایسا نعرہ بلند کرے گا جس سے روح کی ساری گندگی دھل جائے گی اور دنیا کے کونے کونے میں ایک جشن مسرت برپا ہو گا اور انسان، آزادی اور امن سے زندگی بسر کرے گا۔

میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ دفعتاً کمرے میں بیساکھیوں کا شور ابھرا۔ اور بھول سنگھ آہستہ آہستہ میرے قریب آتا دکھائی دیا جب وہ میرے پاس آکر کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ بے حد زرد اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے کھڑے اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میں چونک پڑا۔

"شاعر جی! کیا آپ ہسپتال جا کر مس گریش سے ملیں گے؟"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کچھ نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا تھا کاش میں کسی طرح ابھی اس کے پاس پہنچ سکتا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ مجبوری کے باعث میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر آپ وہاں جا رہے ہوں تو میرا پیغام بھی اسے پہنچا دیجئے گا۔" اس کے لہجے میں کچھ اس طرح کی فریاد تھی کہ انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

ہاں بھئی! میں دفتر سے نکلتے ہی ہسپتال جاؤں گا۔ کہو تمہاری طرف

سے اسے کیا کہوں"۔

میری بات پر وہ ایک لمحے کے لئے احسان مندی کے انداز میں اپنی بیساکھیوں پہ جھکا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔ اور اس نے کہا۔

"بات تو کوئی خاص نہیں۔ فقط اتنی سی بات ہے کہ ـــــ کہ وہ ـــــ شاعر جی آپ اس سے فقط اتنا ہی کہہ دیجئے کہ مجھے اس سے ہمدردی ہے"۔

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس کی آنکھوں کا سوز اتنا بڑھ گیا کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا پھوٹ بہے گا۔ مگر وہ جلدی سے مڑا اور بیساکھیاں ٹیکتا ہوا اپنی کرسی کی طرف چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کچھ سوچنا چاہا۔ مگر میری سوچ کو بھی اب جیسے کسی سہارے کی تلاش تھی۔ چنانچہ میرا ذہن ایک ایسا سیاہ خانہ بن گیا جس میں کبھی تو ایک قابلِ رحم اور پُرسوز مسکراہٹ ابھر آتی تھی اور کبھی پھول سنگھ کی کٹی ہوئی ٹانگ تڑپنے لگتی تھی۔

شام کو جب میں گریش کو دیکھنے کے لئے ہسپتال میں گیا تو وہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر معاً اس کے چہرے پہ درد کی گھٹائیں چھا گئیں اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر جو الفاظ میرے منہ سے نکلے انہوں نے

اس کے آنسوؤں میں اور بھی اضافہ کر دیا اور وہ عورت کی بجائے ایک متحرک آنسو معلوم ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو میں نے اسے پھول سنگھ کا پیغام سنایا۔ وہ پہلے تو میری طرف چپ چاپ اور حیرانی سے دیکھتی رہی پھر یک لخت اس کی آنکھوں میں نفرت چمک اٹھی۔

"ہمدردی!" اس نے حقارت سے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ایک افسانہ نگار ہو کر ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ ہمدردی اس دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ ولیم نے بھی مجھ سے ایک بار یہی کہا تھا۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ محبت کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ ہر انسان عورت سے یہی کہتا ہے مگر وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ولیم بھی جھوٹا تھا۔ پھول سنگھ بھی جھوٹا ہے۔ اور دنیا کا ہر آدمی جو عورت سے ہمدردی اور محبت کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹا ہے میں نے اس جھوٹ کو بہت برداشت کیا۔ مگر اب یہ میری ہمت سے باہر ہے۔ اب مجھے ہر اس آدمی سے نفرت ہے جو مجھ سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اور پھر پھول سنگھ ——— مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ میری ہمدردی کا خیال دل سے نکال دے اور اپنی بیساکھیوں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں اور وہ آنسو بھری نگاہوں سے چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ مگر جب میں ہسپتال سے نکلا تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے

اور ذہن میں دھوآں ہی دھوآں پھیلا ہوا تھا۔

دُوسرے دِن میں نے پھول سِنگھ کو گریش کی ساری گفتگو سنا دی جب تک میں باتیں کرتا رہا وہ خاموشی سے میرا مُنہ دیکھتا رہا اور اس کی قابلِ رحم مسکراہٹ میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ اس کا چہرہ اِتنا بھیانک ہو گیا کہ مجھے اس کی شکل سے خوف آنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھا اور کچھ کہے بغیر اس نے بیساکھیوں کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑا اور انہیں اچھی طرح سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی میز کی طرف چلا گیا۔

دوسرے دِن وہ دفتر سے غائب تھا اور گو اس نے دفتر سے ایک ماہ کی رُخصت لی تھی۔ لیکن میں اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکا۔ حتیٰ کہ ایک دِن اس کی موت کی خبر آ گئی۔

دفتر میں اس کی موت کا باعث اس کی طویل بیماری سمجھا گیا۔ اور حسبِ معمول ایک دو دِن کے بعد تمام کلرک اسے بھول گئے۔ مگر مجھے اس کی موت کا بہت عرصہ قلق رہا اور یہ احساس اس وقت اور بھی بڑھ گیا جب اس کا ایک خط مجھے ایک دیہاتی ڈاکخانے سے ہوتا ہوا بہت دیر سے ملا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:۔

”شاعر جی! —— مجھے یقین ہے کہ اس خط کے ملنے سے پہلے آپ کو میری موت کی خبر بھی مِل چکی ہو گی۔ میں کیوں مر رہا ہوں اس کا سبب میں خود بھی نہیں جانتا۔ میرے دِل میں ایک کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔

لیکن جوں جوں میں اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں وہ اور بھی گہرائی میں دھنستا چلا جا رہا ہے اور شاید یہی میری موت کا باعث ہوگا۔ آپ چونکہ میرے راز سے واقف ہیں اس لئے میں آپ سے اپنی ایک آخری خواہش بیان کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ اسے پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے مس گریش کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ بہرحال وہ جہاں بھی ہو آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ پھول سنگھ نے آپ کی خواہش کے مطابق اپنی بیساکھیوں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک تاریک دُنیا میں رہتا تھا۔ مگر آپ کی خواہش کو پورا کرنے کی فکر میں وہ موت کے زہریلے دھوئیں میں گھر گیا لیکن ـــــ اس زندگی اور موت کی جدوجہد میں بھی وہ آپ کو نہیں بھول سکا اور اسے اب بھی جب کہ اس کی رُوح آہستہ آہستہ فنا کے اتھاہ ساگر میں ڈوب رہی ہے آپ سے ہمدردی ہے۔ مس گریش! ایسی ہمدردی جس سے آپ ہمیشہ نا آشنا رہیں ـــــ

بدنصیب پھول سنگھ

میں اس کی آخری خواہش ضرور پوری کرتا مگر اس کا خط بہت دیر سے پہنچا تھا کیونکہ مس گریش اس کی موت سے چند دن پہلے ہی اپنی ملازمت چھوڑ کر یکایک کسی ایسے مقام کو چلی گئی تھی۔ جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔

دفتر میں اس کی جگہ اب ایک ادھیڑ ٹائپسٹ آگئی تھی جو ادھیڑ عمر اور بدصورت ہونے کے علاوہ چار بچوں کی ماں بھی تھی اور اس کے سامنے آتے

ہی کلرک نگاہیں چرانے لگتے تھے اور اس کمرے میں ایک ایسی افسردگی پیدا ہو گئی تھی جسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری کائنات ایک ان جانے دکھ کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے۔ کمرے کے باہر گھنے درختوں سے گذرتی ہوئی ہوا چیختی تھی اور زمین پر رینگتے ہوئے پتے زندگی کے انجام کا ماتم کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

اب بھی جب کبھی مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے گذرے ہوئے دنوں کی یاد آتی ہے تو معاً میرے سامنے چوبیس آدمیوں کی سنگین مورتیں اُبھر آتی ہیں اور گریش کی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ساتھ پھول سنگھ کی قابل رحم مسکراہٹ جھلکنے لگتی ہے اور کہیں سے آہستہ آہستہ بیساکھیاں ٹیکنے کی آواز اُبھر آتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی افسردہ اور مایوس سر جھکائے کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی ہے ؛

فرار

اُس دن رحمان کی موت پہ ہم سب خوب روئے۔

شام کو جب وہ ہمارے درمیان پھٹے پرانے لحافوں میں لپٹا ہُوا اپنی بیتی ہوئی زندگی کے واقعات سُنا رہا تھا۔ تو کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی آخری باتیں ہیں۔ صبح اس نے اپنے پیوند لگے لحاف سے مُنہ نکالا تو وہ بالکل اچھا بھلا تھا۔ حسبِ معمول اس نے اُٹھتے ہی بازار میں ایک دو چکر لگائے اور آگ کے قریب آ بیٹھا۔ دوپہر کے قریب وہ پھر اُٹھا اور بارش میں کہیں نکل گیا کوئی دو گھنٹے کے بعد جب وُہ واپس آیا تو سر سے پاؤں تک بھیگا ہُوا، سردی سے بُری طرح ٹھٹھر رہا تھا۔ ہم میں سے دو چار آدمیوں نے جلدی جلدی اس کے گیلے کپڑے اُتارے

اور بدن پونچھ کر چادر میں لپیٹ دیا۔ آگ جو بارش کی وجہ سے صبح ہی سے جل رہی تھی۔ مدہم پڑ چلی تھی اس میں لکڑیاں جھونک کر شعلے تیز کئے اور اسے بہت سے لحافوں میں لپیٹ کر اس کے قریب رکھ دیا۔ رحمٰن اس دوران میں کچھ نہیں بولا فقط اس کا بدن زور زور سے کانپتا رہا۔ اور سانس کسی قدر دشواری سے چلتی رہی۔ آگ کے لپیے اور متحرک شعلوں کی روشنی جب زیادہ بھڑک اُٹھتی تو اس کا خشک چہرہ چمک اُٹھتا۔ پھر یک لخت تاریکی چھا جاتی۔ اور یوں معلوم ہوتا جیسے ہم کوئلے کی کسی گہری کان میں اُتر آئے ہیں۔ اس دن بارش کی وجہ سے چونکہ کوئی بھی باہر نہ نکلا تھا اس لئے رحمان کے آنے سے پہلے بڑا شور مچا ہوا تھا۔ جو فقیر لحافوں میں سر چھپائے سو رہے تھے انہیں دق کرنے کے لئے چند ایک نے گانا اور ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ ایک کونے میں بیٹھے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اور باقی ایک ان دیکھے دکھ پر غراتے ہوئے گالیاں بک رہے تھے۔ دراصل وہ ایک پل کے لئے بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ دن بھر سڑکوں پر بھیک مانگنے اور گالیاں کھانے کے بعد جب وہ رات کو اکٹھے ہوتے تو سب کچھ بھول کر ہنسنے اور غرانے لگتے۔ بھول انہیں بڑی مرغوب تھی اور ان کی زندگی پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی۔ کہ وہ خود بھی ایک دردناک بھول بن کر رہ گئے تھے۔ وقت چپکے چپکے ان کے چہروں پر ٹیڑھی لکیریں کھینچتا چلا جاتا مگر وہ یہ دیکھے بغیر کہ ان کی شکلیں بھیانک طور پر بگڑ رہی ہیں ہنستے ہوئے بڑھ رہے تھے زندگی اور وقت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف ان گھڑیوں کو پسند کرتے تھے جب ان کی ہنسی سن کر راہگیر چلتے چلتے رک جائیں چنانچہ اس وقت

بھی وہ ہنس رہے تھے۔ مگر جونہی انہوں نے رحمان کو اس حالت میں دیکھا سب سناٹے میں رہ گئے۔ اس کے ٹھٹھرتے ہوئے جسم کو سنبھالنے کے لیے انہوں نے حسب معمول سب کچھ بھول کر تیزی سے دوڑ دھوپ شروع کی۔ رحمان بہت دیر تک چپ چاپ لیٹا دیوانوں کی طرح ایک ایک کو گھورتا رہا۔ کانپتے ہوئے شعلوں کی روشنی اس کے چہرے کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ ہم اس کے ارد گرد بیٹھے غور سے اس کی حالت دیکھ رہے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ سنبھل گیا اور کمزور آواز میں اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہمیں اپنی زندگی کے کچھ واقعات سنانا چاہتا ہے۔ ہم نے کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گرد جھریوں، بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے ہماری شکلیں بگاڑ دی تھیں۔ ہم سب انسان تھے مگر حیوانوں کی طرح ایک دوسرے کی زندگی سے بے خبر تھے۔ کسی نے بھی آج تک یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ کہ اس کا ساتھی کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کبھی واپس بھی جائے گا یا نہیں۔ ہمارے لیے ماضی ایک گمشدہ شے تھی اور تاریکی کے اتنے چھوٹے بڑے دائرے ہمارے اور گزرے ہوئے دنوں کے درمیان گھوم رہے تھے کہ انہیں چیرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ مگر رحمان آج ہمیں اپنے دکھ سکھ کا ہمراز بنا کر اس اجنبیت کو دور کرنا چاہتا تھا جو کسی خیال کی طرح ہم پر حاوی ہو چکی تھی۔ ہم اس کے نزدیک کھسک آئے ۔ وہ مسکرایا اور اس کے زرد دانتوں میں تھوک کی چھوٹی چھوٹی لکیریں پیدا ہو کر ٹوٹ گئیں۔ کسی حد تک مبہم مگر صاف آواز میں اس نے کہا: "مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا

ہُوں مگر میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ باتیں کروں اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس وقت باتیں نہ کیں تو ممکن ہے پھر کبھی نہ کر سکوں کیونکہ...... شاید اب چل چلاؤ کا وقت ہے؟"

وہ کھانسنے لگا۔ تھوڑی دیر سانس درست کرنے کے بعد وہ پھر بولا۔

"زندگی نے ایک پُراسرار طریق پر ہم سب کو ایک ہی راہ پر لا ڈالا ہے۔ ہم کون ہیں ہمارا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ ہم کیوں اس طریقے سے زندہ رہنے پر مجبور ہیں اس کا جواب مجھ سے بہتر ہمارا ماحول دے سکتا ہے جس میں ہم زندگی گزارتے ہیں میں تمہارے متعلق بہت کم بلکہ کچھ بھی نہیں جانتا کیونکہ اس حالت میں کوئی بھی اپنا اصلی چہرہ دکھانے یا دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مگر اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ تم میں سے بہت کم پیدائشی اور پیشہ ور فقیر ہیں تمہارے چہروں پر مجھے اجنبی ہاتھوں کی بے نشان چوٹیں نظر آتی ہیں۔ میرے چہرے پر بھی بہت سے زخم ہیں مگر گہرے اور بھیانک اس لئے میں بھی کبھی اپنی گھناؤنی شکل دکھاتے ہوئے ڈرتا ہوں ——"

اس کے چہرے پر اچانک ایک کرب پیدا ہوا اور وہ رُک گیا بارش برابر ہو رہی تھی۔ کوٹھڑی کے جھکے ہوئے ٹین پر قطرے ٹپ ٹپ پڑ رہے تھے۔ اور کبھی کبھی بادل کی گرج اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ ہوا کے تیز جھونکے سڑک پر یوں دوڑتے دکھائی دیتے جیسے طوفان میں جہاز کے بادبان پھیل رہے ہوں اس نے ہلکی سی ایک آہ بھری اور کہا۔ "نہیں معلوم ہوگا جب میں یہاں آیا تھا تو کس قدر خبیث پاپی اور خاموش تھا۔ ان دنوں میں اپنے آپ سے اس قدر بے نیاز تھا کہ مجھے تمہاری بیگانگی اور نرگھے پن سے ذرا بھی دُکھ نہ

ہوا۔ آخر تم میرے تھے ہی کون جو میں تم سے کسی بدسلوکی کا گلہ کرتا۔ میں خود تمہارے پاس آیا تھا، بے بس، مجبور اور شکست خوردہ ہو کر پناہ ڈھونڈنے آیا۔ ان دنوں سماج کے قانون چابک کی طرح حملہ آور ہو کر میرے ارادوں کو نڈھال کر چکے تھے۔ زندگی میرے لئے ایک چٹانوں بھرا رستہ بن گئی تھی جسے عبور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اب ان کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے' بس اتنا سمجھ لو کہ پیہم ناکام کوششوں اور تلخ تجربوں کے بعد مایوس ہو کر میں نے خودکشی کرنا چاہی۔ مگر ایک ایسا حادثہ پیش آ گیا جس نے میری ہمت چھین لی۔ جس طرح میں زندگی سے فرار ہو کر آیا تھا اسی طرح موت سے بھی فرار ہو گیا۔ اور پھر یہاں آ گیا — یہاں — جہاں نہ زندگی ہے نہ موت —!

کھانسی پھر درد کی طرح اٹھی۔ اور وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مرتے ہوئے دکھ کی جھلک ظاہر ہوئی مگر جلد ہی غائب ہو گئی۔ اور وہ اپنی داستان کا آخری حصہ سنانے لگا — میں خودکشی اس لئے نہ کر سکا کہ میرے اور موت کے درمیان ایک ایسی ہستی نمودار ہو گئی جس نے میرے دل میں ایک نئی مسرت بھری کپکپی دوڑا دی۔ اور میں اس کیلئے زندہ رہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس دن جب میں شہر سے باہر نکلا تو ہر ایک چیز کو ایسی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جیسے تھوڑی دیر بعد ایک عظیم فاصلہ میرے اور اس کے درمیان حائل ہو جائے گا۔ اور ایسے سیاہ نقطے اس فاصلے میں ابھر آئیں گے کہ میرے لئے دیکھنا اور چھونا ناممکن ہو جائے گا۔

وہ خوشنما سڑک جس پر میں چل رہا تھا۔ ہرے بھرے پیڑ نکھرے نکھرے سے مکان ——— سڑک کے آخری نقطے پر پرکار کے بازو کی طرح اُٹھا ہوا آسمان اور اس پر آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے گلابی بادل سب میرے لیے ایک اُداس دلکشی کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ شہر سے نکل کر میں دریا پہ پہنچا اور پل عبور کر کے کنارے کنارے ٹہلتا ہوا دور نکل گیا۔ شام ہو رہی تھی آسمان کا وہ حصہ جہاں سورج ڈوب رہا تھا سُرخ ہو چکا تھا اور اس کا عکس بہتے ہوئے پانی میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ کنارے کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی گھاٹیوں اور میدانوں میں سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی اور وہ آوازیں جو دُور سے ان جانے لہجہ میں سُنائی دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سکوت کے آغوش میں فنا ہو رہی تھیں۔ دوسرے کنارے پہ درختوں کی چوٹی سے سیاہی کی ایک لمبی لکیر بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پہ سر جُھکا کر بیٹھ گیا۔ اب صرف چند لمحوں کی دیر تھی۔ پھر تمام حسین اور ہیبت ناک چیزیں میری نظروں سے اوجھل ہونے والی تھیں۔ شام کی ڈوبتی ہوئی روشنی، سسکتی ہوئی آوازیں۔ ہوا میں غوطے مارتے ہوئے پرندوں کی اڑانیں یہ سب کچھ کتنا حسین تھا۔ مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان تمام چیزوں کے پیچھے ایک ہیبتناک جذبہ کپکپا رہا ہے۔ میرے قدموں کے قریب گدلے پانی کی روانی سے ایک خوفناک موسیقی اُبھر رہی تھی۔ ایک دلکش اور دو بھری ٹھرتھری مجھے اپنی طرف بُلا رہی تھی۔ جیسے ازل سے میرا اور اس کا سمبندھ

ہو۔ اس کے سُروں میں فراق کا دُکھ تھا۔ میرے جسم میں ایک پُر مسرت کپکپی دوڑ گئی۔ اور ایک نیا جذبہ میرے اندر اس شدت سے نمودار ہُوا کہ میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے کچھ سوچنا چاہا۔ مگر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے ذہن میں کچھ اٹک گیا ہے۔ کیونکہ مجھے اپنے چاروں طرف پانی کی خوفناک موسیقی کے سِوا اور کِسی چیز کی موجُودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ موسیقی کے راگ لمحہ بہ لمحہ تیز اور گہرے ہو رہے تھے۔ اور میرے بدن کا رواں رواں تھرتھری میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یکایک پانی کے سینے سے لپٹ جاؤں۔ اور اُسے اس شدت سے بھینچوں کہ ہم ایک دُوسرے میں گھُل کر رہ جائیں۔ ملاپ اور وصال ——— وصال اور ملاپ ——— پھر ان دیکھی خوشیاں ——— ان دیکھی ہنسی ——— اور ——— اور ——— میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

سرد پانی میں میرے پاؤں آہستہ آہستہ ڈوبنے لگے اور ایک تیز اور تلخ جھرجھری میری رگوں میں سُرعت سے پھیل گئی۔ شام کے عمیق سناٹے میں پانی کی موسیقی زیادہ گہری ہوتی چلی گئی اور یُوں معلوم ہونے لگا جیسے کوئی نوحہ تاریک اور اتھاہ گہرائیوں میں غوطے مار کر اُبھر رہا ہے۔ میں بڑھتا چلا گیا۔ پانی رینگتا ہُوا میرے گھٹنوں تک آ پہنچا۔ مگر میرے قدم نہ رُک سکے حتیٰ کہ میں کمر تک پانی میں ڈوب گیا۔ اب کوئی دیر نہ تھی۔ چنانچہ میں نے آخری قدم بڑھانے سے پہلے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور پُل ایک دھندلے سے کھلونے کی طرح دِکھائی دے رہا تھا۔ شفق پر سیاہی چھا رہی تھی۔ گھاٹیاں اور میدان سُرمئی ہوتے جا رہے تھے۔ اور ایک گہرا سکوت میرے ارد گرد جم کر گھُور رہا تھا۔ سب چیزیں

اُداس ہو رہی تھیں۔ زمین اور آسمان پانی اور درخت، میدان اور گھاٹیاں۔ سب پر افسردگی چھا رہی تھی۔ اور میں —— میں تو زندگی ہی سے اُداس ہو چکا تھا۔ اور یہ اُداسی اس قدر شدید تھی کہ مجھے موت کے قریب پہنچکر بھی لوٹنے کی خواہش نہ ہُوئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور آخری قدم اُٹھانا چاہا مگر یکایک کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میرے قدم برف کی طرح جم گئے اور مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے لوہے کی سینکڑوں زنجیریں ناچتی ہُوئی میرے اردگرد ایک جال بُن رہی ہیں۔ میں نے سوچا شاید پھر کوئی قانون میرے تعاقب میں یہاں تک آپہنچا ہے اور چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیئے اس کی زد سے نکل نہ جاؤں۔ اِس خیال سے خوفزدہ اور سہم کر میں نے مُڑ کر دیکھا تو —— دریا کے کنارے پر ایک ننھی سی لڑکی تالیاں بجاتی ہُوئی ہنس رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میرے دل میں ایک عجیب سی چیز مچلنے لگی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ آنکھیں بند کر کے گہرائی میں اُتر جاؤں مگر لڑکی کی ہنسی میں اس قدر کشش تھی کہ میری ضد کونپل کی طرح چپکے سے جھک گئی۔ اور موسیقی کے تیز اور نوکیلے سُر جو میری رُوح کو چیرتے ہُوئے بڑھ رہے تھے۔ یکایک ٹوٹ کر بکھر گئے۔ میں کچھ سوچے بغیر کنارے کی طرف بڑھا اور دریا سے نکل آیا۔ لڑکی ابھی تک ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں کچھ ایسا ترنم تھا کہ خواہ مخواہ ستارے یاد آجاتے تھے۔ اس کے ننھے ننھے ہونٹوں میں بھی وہ ستارے کانپ رہے تھے اور یہ ستارے اس سلیقے سے چمک رہے تھے کہ وہ خود بھی ایک متحرک ستارہ بن گئی تھی۔ میں سب کچھ بھُول گیا اور بانہیں پھیلا کر میں نے اس سے

کہا۔ "میرے پاس آؤ گی؟" اور یہ کہہ کر مجھے محسوس ہؤا جیسے میرے سینے میں ایک باپ کا دِل دھڑک رہا ہے۔ وہ اسی طرح ہنستی ہوئی میرے بازوؤں میں آ گئی۔ اور میں نے اسے گود میں اُٹھا کر پوچھا ——— "تم کون ہو؟"

"مونا ———!" اس نے پہلے سے پیارے انداز میں کہا اور میری نگاہوں میں پھر ستارے گھومنے لگے۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم یہاں کیسے آئیں؟"

"کھیلنے کے لئے مجھے ریت بڑی اچھی لگتی ہے۔"

"تم اکیلی ڈرتی نہیں؟"

"اونہوں"! اس نے سر ہلا کر کہا۔ اور پھر اچانک اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"مرنے کے لئے"۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مرنے کیلئے"۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی پیدا ہوئی۔ "مرنے کیلئے ——— مرنے کیلئے ———" اس نے دو تین بار یہی الفاظ دُہرائے گویا مرنے کا مطلب سمجھنا چاہتی ہے۔ پھر اس کے متبسم چہرے پر اداسی سی جھلک آئی اور یکایک اس نے سر جھکا کر میرے کان میں چپکے سے کہا۔

"نہیں ——— مرنا بہت بُری بات ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد کسی نے مجھے گود میں نہیں اُٹھایا۔ تم تو ایسے نہیں ہو، پھر تم بھی مر گئے تو مجھے گود میں کون اُٹھائے گا؟"

یہ کہکر وہ چُپکے سے میرے گلے سے لگ گئی۔ میرے سینے میں ماں کی مامتا اور باپ کا پیار جاگ اُٹھا اور میں نے اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ اور دو آنسو چُپکے سے میری پلکوں پر نمودار ہو کر کانپنے لگے۔ وہ کچھ دیر چُپ چاپ میرے سینے سے لگی رہی۔ گویا بڑی دیر کے بعد اِسے میٹھی نیند سونا مِلا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "اب تو نہیں مرو گے؟" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر سیکڑوں ستارے میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور میں بے بس ہو کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

جب میں اچھی طرح رو چکا تو مونا کو گود میں اُٹھائے ہُوئے اس راستے پر ہو لیا جو اس کے گھر کو جاتا تھا۔ تاریکی اچھی طرح پھیل چکی تھی اور دُور آسمان کے جھُکاؤ کے قریب چھوٹے چھوٹے شعلے چمک رہے تھے۔ مونا مجھے اسی طرح لئے جا رہی تھی۔ اب وہ بے تکان باتیں کر رہی تھی۔ چنانچہ ہم ہنستے اور باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔ کہ دفعتہً سامنے سے ایک بُوڑھا آدمی نمودار ہُوا۔ جس کی سانس تیز چلنے کی وجہ سے پھُولی ہُوئی تھی۔ مونا کو میری گود میں دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی طرف لپکا۔ اور ایک تیز جھڑکی دیکر اس نے پُوچھا "کہاں گئی تھی؟" مونا میری گود سے چمٹ گئی۔ میں سمجھ گیا یہ اس کا چچا تھا۔ جس کے متعلق وہ مجھے بتا چکی تھی۔ میں نے اُس سے پُوچھا۔

"بھئی تم بچی سے اس قدر بے رحمی کے ساتھ کیوں پیش آتے ہو؟"

اس نے میری طرف مُڑ کر جواب دیا۔

"آپ نہیں جانتے یہ کس قدر ضدی ہے۔ میں نے کئی بار اسے دریا کے

کنارے کھیلنے سے منع کیا ہے۔ مگر یہ مانتی ہی نہیں۔

اس کے لہجہ میں درشتی اور اجنبیت تھی۔ اس لئے میں مونا کے خوف کی وجہ آسانی سے سمجھ گیا۔ اس نے مونا کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر وہ میری گود میں کسمساتی رہی۔ میں نے اسے دلاسا دے کر اتارا اور جب بوڑھے کے سپرد کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی عزیز ترین چیز میرے ہاتھ سے چھن رہی ہے۔ بوڑھا اسے ساتھ لیکر ایک طرف کو چل دیا اور جلد ہی نظر سے غائب ہو گیا اور میں پتھر کے بت کی طرح اس کے وجود کو تاریکی میں گھلتے دیکھتا رہا۔ میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جو کچھ ہوا وہ ہنگامی ہو گیا۔ مونا مجھے ملی اور کھو بھی گئی۔ اور میں اس سے جدا کچھ نہ کر سکا کہ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے متعلق سوچنا شروع کر دوں مگر میرا سوچنا بیکار تھا کیونکہ میں اسے پا نہیں سکتا تھا۔ اور وہ اس لئے کہ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ میرے سامنے آسمان کے جھکاؤ کے قریب سینکڑوں شعلے چمک رہے تھے اور میرا ذہن خالی تھا۔ فقط ایک ہیبتناک گونج کہیں سے پوری شدت کے ساتھ ابھر رہی تھی اور اس میں مونا کا متبسم چہرہ ستارے کی طرح جھلک رہا تھا۔ اس دن جب میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا لوٹ رہا تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے مونا کی خاطر زندہ رہنا چاہئے۔ ممکن ہے کبھی میں پھر اس متحرک ستارے کو دیکھ سکوں۔

دوسرے دن شام کو میں گھر سے نکلا اور غیر شعوری طور پر دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ اور رات گئے اسی جگہ بیٹھا مونا کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ

آئی۔ دریا کے پانی میں اب بھی موسیقی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مگر یہ موسیقی دردناک تھی۔ ایسی دردناک کہ میرا دل کسی نامعلوم غم کے مارے پھٹا جاتا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی انجمن جگمگا رہی تھی۔ فضا میں موت کا سکرات طاری تھا مگر ــــ مگر میری مونا۔ میری زندگی کے آسمان کا اکیلا ستارہ، میرے دل کے اندھیرے میں مسرت کی پہلی کرن، کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دریا کی دردناک موسیقی میں، ستاروں کی جگمگاتی ہوئی انجمن میں، فضا کے ہولناک سکوت میں اس جان تمنا کا سراغ کہیں نہیں ملتا تھا۔ کہیں نہیں ــــ!

ــــــــــــ! وہ رات گذر گئی، اور اسی طرح کئی اور سنگدل اور بے رحم راتیں گذر گئیں۔ مگر مونا کو آنا تھا، وہ نہ آئی، ــــ

میں نے کئی بار سوچا کہ کیوں نہ خودکشی کر کے سارا جھگڑا ہی چکا دوں، مگر ہر دفعہ یہ خیال مجھے روک لیتا تھا، کہ اگر میرے بعد مونا یہاں آئی تو وہ مجھے کہاں تلاش کرے گی اور میں اس تک کیسے پہنچ سکوں گا۔ مگر میں زندہ بھی کیسے رہتا۔ مجھے دنیا سے نفرت ہو چکی تھی۔ انسانوں سے، ان کے قوانین سے، ان کی جدولوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، چنانچہ میں نے یہاں پناہ لی۔ اس اندھیری کوٹھڑی میں جہاں تاریکی اور سائے ایک دوسرے میں گھلے ہوئے ہیں۔ اور واقعی مجھے پناہ مل گئی۔ میں محبت اور نفرت کے جذبات سے ناآشنا ہو گیا۔ میرا ذہن مردہ ہو گیا میرے اندر جو انسان رہتا تھا وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ میں نے اسے خود مار ڈالا۔ کیونکہ وہ مجھے جلاتا تھا۔ میرے اندر آگ بھڑکاتا تھا۔ میری توہین کرتا ہوں، مگر وہ مر گیا۔ میں نے اسے مار ڈالا، اس کا گلا گھونٹ دیا،

اور بالکل اسی طرح ہو گیا جیسے تم ہو ۔ مردہ ۔ قبر ۔ لاش!

یکایک وہ رک گیا اور ہمارے حیران چہروں کو دیکھ کر مسکرایا، اس کے نحیف ہونٹ ایک لمحے کے لئے پھیلے اور پھر معمولی حالت پر آ گئے، زیادہ بولنے کی وجہ سے اس پر تکان طاری ہو گئی تھی، چنانچہ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے کہا

"میں خودکشی کرنا چاہتا تھا، مگر نہ کر سکا، چنانچہ میں نے اپنی روح کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر یہ میری بھول تھی میں سمجھا تھا کہ میں نے اس کو ایک کبھی نہ کھل سکیگی گرہ سے مجھ سے انتقام لینا تھا چنانچہ ہر روز شام کو وہ جاگ اٹھتی اور ہنسی میں لسا جاتی ۔ ایک شعلہ سا چمکتا، اور میری محبت بیدار ہو جاتی، شفق سے لاکھوں ستارے ابھرتے دکھائی دیتے اور میں مونا کی تلاش میں دریا کے کنارے پہنچ کر گھومنے لگتا ۔ جب رات ہو جاتی اور ستارے پانی میں اتر کر کانپنے لگتے تو اداس گھاٹیوں کی تنہائی مجھے اپنی آغوش میں لے کر گھورنے لگتی ۔ اور میں مایوس ہو کر لوٹ آتا ۔ ہر شام انتظار ـــ انتظار ـــ انتظار ـــ مگر وہ کون تھی، فطرت کی حسین گدگدی ستاروں کی مسکراہٹ، میری کائنات، میری تلخ زندگی کا حسین ترین خواب، ہاں میری زندگی تلخ تھی مگر میں زندہ رہنا چاہتا تھا ۔ اس لئے میں نے زندہ رہنے کے لئے ایک سہارا تلاش کر لیا ۔ میں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت بت بنایا، اور اس بت کا نام مونا رکھا، میں نے اس سے محبت کی ۔ میں نے اپنی زندگی کو پیار سے آشنا کرنا چاہا ۔ میں نے اپنے غم نصیب دل کی بے قرار دھڑکن سننا چاہی ـــ میں نے زندگی کی تلخی سے، بیزاری سے اور موت سے بچنا چاہا ـــ

اور ـــ اور ـــ مونا ـــ خواب ـــ بت ـــ!

پھر میں بچ گیا ——— میں بچ گیا ——— !

یکا یک وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے زرد دانت باہر نکل آئے۔ اور وہ یک لخت بیہوش ہو گیا۔

جب وہ اسی بے ہوشی کے عالم میں مر گیا تو ہم نے اُسے کفن میں لپیٹا اور آخری منزل پر پہنچانے لے چلے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو رہی تھی کہ چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ جب ہم نے اُسے قبر میں اُتارا۔ تو بارش زیادہ تیز ہو گئی۔ اور مٹی ڈالتے ڈالتے اس کا کفن پانی میں بھیگ گیا۔ بڑی دقّت کے بعد جب قبر برابر ہوئی تو ہم واپس آئے اور دن بھر بیٹھے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

× × × ×

جوں جوں شام قریب آتی گئی ہمیں یوں محسوس لگا جیسے ہمارے دلوں سے آہیں اُٹھ رہی ہیں۔ اور پھر اچانک چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ اور ہم اتنے غمزدہ ہو گئے کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نئے چہرے

رات کے نو بجے ہیں، خواجہ بہار اللہ اور دو فلم ڈائرکٹر چند ایکٹرسوں کی تلاش میں طوائفوں کے ایک مشہور اڈے کا چکّر کاٹ رہے تھے۔ جوں جوں تاریکی زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ بازار کی رونق بڑھ رہی تھی۔ بالاخانوں میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں دکانیں سج رہی تھیں اور کھڑکیوں میں پھول اور کلیاں خوشبو میں لپٹی ہوئی سڑک پر سے گزرنے والوں کو گھور رہی تھیں خواجہ بہار اللہ آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتے ہوئے چل رہے تھے۔ اور حسبِ معمول اس ماحول میں بھی اپنی وسیع معلومات کا رعب گانٹھ رہے تھے۔ اڈے کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جتنی طوائفوں کے مکان تھے۔ انھیں ایک ایک کر کے یاد تھیں۔ بلکہ انہیں ان کے کئی پشتوں کے

سب نام بھی معلوم تھے۔ جب کبھی وہ منہ اٹھا کر کسی کھڑکی کی طرف دیکھتے اُن کی ترکی ٹوپی پیچھے کی طرف کھسک جاتی۔ اور وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے اُسے پھر ٹھیک طریقے سے جما لیتے۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی کہ وہ ٹوپی ٹھیک کرتے وقت کوٹ کی گرد جھاڑتے ہوئے کچھ نہ کچھ بڑبڑانے لگتے اور مجھے وہ وقت کبھی نہ بھولے گا، جب ایک دن بمبئی میں ایک فلم کمپنی کے سٹوڈیو سے ناچ دیکھنے کے بعد ٹرام میں بیٹھے بیٹھے میں نے ان کی بڑبڑاہٹ سننے کی کوشش کی۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے ہیں۔

فلم ڈائریکٹر صبح ہی بمبئی سے یہاں پہنچے تھے۔ اور چونکہ انہیں جلد ہی واپس جانا تھا۔ اِس لئے وہ تھکاوٹ کے باوجود آج ہی نئے چہروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے اور خواجہ بہا، اللہ کی رہنمائی میں ایک ایسی راہ پر چل رہے تھے، جو سیدھی دکھائی دینے کے باوجود پرپیچ اور بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ اور جس کی منزل کا کوئی اور چھور نہیں ملتا تھا۔ سڑک بالکل سیدھی تھی۔ فقط اس میں ایک جگہ ذرا سا گھماؤ تھا۔ اور یہ گھماؤ بھی پنواڑیوں اور گجرے بیچنے والوں کی مشترکہ کوششوں سے اڈے کا عیب بننے کی بجائے اُس کا حُسن دوبالا کر رہا تھا۔

اسی گھماؤ پر ابراہیم گھڑی ساز کی دوکان تھی جو سارے اڈے میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ اور جسے تمام کسبیوں کے اندرونی و بیرونی حالات سے واقفیت تھی۔ خواجہ بہا راللہ کو دیکھتے ہی وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے یوں ملے جیسے دو جیب کتروں کی ملاقات ہو رہی ہو۔

"ہی ہی ہی" ابراہیم گھڑی ساز ہنسا اور اپنی ٹوپی سر پر جھکا کر کہنے لگا۔

"کدھر بھول پڑے آج؟"

"بھئی یہ ہمارے ڈائرکٹر ہیدار صاحب چند ایکٹرسوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ خواجہ بہار اللہ نے ہنس کر کہا اور اُن کے مصنوعی دانت بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے۔ میں نے سوچا۔ چلو لگے ہاتھوں انہیں یہاں کی سیر کرا دوں۔ چلو آؤ میں اسی لئے تمہاری طرف آیا تھا۔

"ہیں — ہی ہی — ہیں —" ابراہیم گھڑی ساز ٹوپی اُتار کر سر کھجاتا ہوا بولا۔ "اچھا چلئے اب آپ آئے ہیں تو چلنا ہی پڑے گا۔

"مگر کوئی اچھی لڑکی یہاں ہے بھی یا نہیں۔" خواجہ بہار اللہ نے شلوار کے بل درست کرتے ہوئے کھٹک کر کہا۔ اور پھر بڑبڑا کر بولے — "انوری کہاں ہے؟"

"انوری — ہی ہی ہی!" ابراہیم گھڑی ساز بولا۔ "وہ سالی تو بلند اقبال شاہ کے پلے پڑ گئی ہوئی ہے۔ مگر اس کی بہن گھر پر ہی ہے۔ آیئے پہلے آپ کو وہ دکھا دوں" اور وہ ہمیں ساتھ لے کر سڑک پر چلنے لگا۔ چار پانچ مکان چھوڑ کر وہ ایک بیٹھک پر چڑھ گیا۔ اور خواجہ بہار اللہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈائرکٹر ہیدار کو ایک دو طوائفوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے لگے۔

وہ جو سامنے کھڑکی میں بیٹھی ہے نا! اس کا نام زرینہ ہے۔ بڑی چنچل چھوکری ہے اس کی ماں بڑی حرامزادی ہے سالی! اسے کسی فلم کمپنی میں جانے ہی نہیں دیتی۔ ابھی چند روز ہوئے —"

"چلے آیئے —" اوپر سے ابراہیم گھڑی ساز نے جھانک کر کہا۔ اور خواجہ صاحب

کو اپنی گفتگو ناتمام چھوڑ کر اوپر چسپو ھنا پڑا۔

جب ہم بیٹھک پر پہنچے تو ابراہیم ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ ہماری پیشوائی کے لیے کھڑا تھا۔

"آیئے !" اس نے گنگنا کر کہا۔ اور پھر خواجہ بہار اللہ کی طرف دیکھ کر بولی "خواجہ جی آپ نے تو حد ہی کر دی۔ انوری بہن بھی گلہ کر رہی تھیں۔ آپ ہمیں بھول گئے ہیں" تشریف رکھئے۔"

خواجہ بہار اللہ جواب دینے کے بجائے بڑبڑانے لگے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اور وہ اپنے مصنوعی دانت چمکاتے ہوئے بولے "میں پچھلے دو ماہ سے بمبئی میں تھا۔ اس لیے بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابھی چند روز ہوئے وہاں سے آیا ہوں۔ اور آج کل یہاں آنیوالا ہی تھا کہ ڈائریکٹر بیدار مجھے لینے کے لیے آگئے۔"

"مجھے" لڑکی مسکرا کر بولی۔ "مگر جب تک بہن انوری نہ آئیں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"ابھی آپ اپنا ارادہ نہ بتائیں۔" ڈائرکٹر بیدار نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "ہمیں تو آپ کا چہرہ بے حد پسند ہے۔"

لڑکی تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ خواجہ بہار اللہ کچھ بڑبڑانے لگے۔ اور ڈائرکٹر بیدار کے اسسٹنٹ مسٹر دھنی لڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگے گویا وہ آئس کریم کی ڈلی ہو۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ کھڑکی پر پڑا ہوا نیلا پردہ ہوا سے ہل رہا تھا۔ اور پاس والی بیٹھک سے بوتلوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ

وحشیانہ قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ دفعتہً سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور دروازے میں ایک مولوی صاحب کا چہرہ نمودار ہوا ہمیں دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے۔ اور پھر اتنی تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف مڑے کہ ان کے کندھوں پر پڑا ہوا رومال جس سے شاید وہ اپنا منھ چھپاکر آئے تھے دہلیز پر گر پڑا۔

ڈائرکٹر بیدار ہنستے ہنستے دوہرے ہوگئے۔

"یہ کون تھے بھئی؟" خواجہ بہار اللہ نے جن کی آنکھیں ہنسی کی وجہ سے تقریباً بند تھیں۔ لڑکی سے پوچھا

"مولوی سلامت اللہ شہر کے مفتی کے بیٹے ہیں۔"

"مفتی شہر کے جانشین! واللہ" مسٹر دھنی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اور ایما ہم گھڑی بھر چپ چاپ بیٹھا سر کھجانے میں مشغول رہا۔ جب ڈائرکٹر بیدار کی ہنسی تھمی تو انہوں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تو پھر آپ نے کیا سوچا؟ ہم تو آپ کو یہی کہیں گے کہ بمبئی ضرور چلئے بڑا اچھا شہر ہے۔ گرد بہت کم اُڑتی ہے۔ سڑکیں بہت صاف ستھری ہیں۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے اور سمندر کا کنارا ۔۔" اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ڈائرکٹر بیدار فلم کمپنی کا مالک ہونے کے بجائے بمبئی کارپوریشن کا ایجنٹ ہے۔

مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر فیصلہ بہن انوری ہی کریں گی۔ کیوں چچا چچا ۔۔؟ لڑکی نے کہا اور دفعتاً میری نگاہیں اُس شخص پر پڑیں۔ جو ابھی دوسرے کمرے سے نکل کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی لانڈری کی

ڈھل گرآیا ہے، سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور ماتھے پر گرے ہوئے اور آنکھوں میں اتنی بھوک تھی کہ میں کانپ اٹھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اپنی کھوکھلی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"یہ بمبئی کی ایک فلم کمپنی کے مالک ہیں۔ اور خواجہ صاحب کے ساتھ آئے ہیں ان کا ارادہ ہے کہ مجھے اپنی کمپنی میں ملازم رکھ لیں۔"

"تو پھر ———؟" چاچا نے انتہائی سرد مہری سے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ انوری بہن آئیں تو بہتر ہوگا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" چاچا نے اسی کھوکھلی آواز میں کہا۔ اور ڈائریکٹر بہار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"اجی دراصل بات یہ ہے کہ انوری ہی اس معاملے میں مختار ہے۔ اس لئے" اور وہ کھانسنے لگا۔

"چلو بھئی خواجہ!" ڈائریکٹر بہار نے پان چباتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے تو اپنا فیصلہ ہی سنا دیا۔"

خواجہ بہار اللہ چھڑی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شلوار کے بل درست کرنے لگے۔ ڈائریکٹر بہار دھیرے دھیرے جوتے پہننے لگے۔ اور مسٹر دھنی پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر گنگنانے لگے۔ ابراہیم گھڑی ساز جو پیتل کے ایک خوبصورت گلدان میں رکھے ہوئے پھول سونگھ رہا تھا چپکے سے اٹھا اور مسٹر دھنی کے قریب جا کر کہنے لگا۔ "اس کا چاچا ایک ہی اُلّو کا پٹھا ہے۔ انوری ہوتی تو اب تک بات

بھی طے ہوگئی ہوتی خیر ـــــ ذرا سیڑھیاں سنبھل کر اتر یئے گا۔ بڑی ذاہیات سی ہیں۔" اور وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ میں نے اترنے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو خواجہ بہار اللہ اور انوری کی بہن میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ سڑک پر پہنچ کر مسٹر دھنی نے آہ سی بھر کر کہا: "غضب کی چھو کری تھی۔ دو چار کلوز اپ تو اس کے بہترین تھے۔ اور لانگ شاٹ تو ـــــ"

"لاحول ولا" ڈائریکٹر بیدار نے بھنا کر کہا۔ "کبھی تو سمجھ بوجھ کی بات کیا کرو لانگ شاٹ میں تو اس کا چہرہ بالکل سپاٹ معلوم ہوگا۔ اور پھر ـــــ"

"آئیے! اب زرینہ سے بھی بات چیت ہو جائے۔" یکایک خواجہ بہار اللہ نے ڈیوڑھی میں نمودار ہو کر کہا۔ اور ڈائریکٹر بیدار چونک پڑے۔

"ارے بھئی اتنی دیر کیوں؟" انہوں نے خواجہ سے پوچھا۔

"اس حرامزادی کو سمجھا رہا تھا۔ کہ مجھ میں اور بیدار میں کوئی فرق نہیں تم جیسے بھی ہو ان کے پاس ضرور جاؤ۔ بڑا اچھا شہر ہے۔ گرد بہت کم اڑتی ہے سڑکیں بہت صاف ہیں۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے اور سمندر کا کنارا ـــــ"

"ہی ہی ـــــ" ابراہیم گھڑی ساز سے جو دوسری طوائف کے مکان پر ہماری آمد کی اطلاع دینے گیا تھا واپس آکر کہا ـــــ "چلئے زرینہ کو بھی دیکھ لیجئے۔" اور ہم پھر ایک بیٹھک کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"کتنی لنبو سیڑھیاں ہیں؟" مسٹر دھنی ایک جگہ ٹھٹھر کر بولے۔ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ عمارت سکھوں کے عہد کی یادگار ہے۔"

"بھئی دھنی چپ بھی رہو۔" ڈائریکٹر بیدار نے پیچھے مڑ کر کہا۔ "وہ ڈیوڑھی

میں کھڑی ہے۔ اور تمہیں پھبتیاں سوجھ رہی ہیں۔" مسٹر دھنی خاموش ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں ایک مدھم سایہ نمودار ہوا۔ اور پھر غائب ہو گیا۔ خواجہ صاحب کی بڑبڑاہٹ سنائی دی اور میں دیوار کا سہارا لے کر گرتے گرتے بچا۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے جو دری پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ معنوی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر بیدار خواجہ بہاء اللہ اور مسٹر دھنی بڑے اطمینان سے تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ اور ابراہیم گھڑی ساز میرے قریب بیٹھ کر سر کھجانے لگا۔

"کہئے کیسے تکلیف گوارا کی؟" عورت نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دروازے کی طرف دیکھ کر نوکر کو آواز دی۔ "صابری! ذرا یہ پان تو دھو لانا بیہودے پہلے ہی کیوں ٹھیک نہیں رکھتا۔" نوکر لنگڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ہماری طرف نگاہ کئے بغیر یوں واپس چلا گیا جیسے ہم اس کے لئے کسی اخبار کے پرانے پرچے تھے۔ کمرے میں کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ خواجہ بہاء اللہ سامنے والی دیوار کے ترچھے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے ٹوپی درست کرنے لگے۔ ڈائریکٹر بیدار نیا سگرٹ سلگانے لگے۔ اور مسٹر دھنی دروازے کو یوں گھورنے لگے جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے چوکھٹ سمیت نگل جائیں گے۔ دروازوں پر لٹکے ہوئے گلابی پردے کبھی کبھی ہوا سے پھولنے لگتے تھے اور اس کے اوپر روشندان کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے سے آسمان نیلے پانی کا ایک چھوٹا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین ستارے جھلملا رہے تھے۔ مجھے کمرے کی خاموشی اور سکون سے نفرت ہونے لگی اور میں نے سوچا اگر میں کونے میں پڑا ہوا ستار بجانے لگوں اور یہ ادھیڑ عمر عورت اور کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام مرد ناچنے لگیں تو زندگی کا

سب سے بڑا مقصد پورا ہو جائے۔ زندگی ایک ناٹک ہے اور ہم سب کو اس میں ناچنا پڑتا ہے۔ ناچ گلیوں اور سڑکوں سے شروع ہوتے ہیں اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ ابھی اس کمرے میں ناچ ہوگا۔ پھر بمبئی میں ناچ ہوگا۔ پھر ملک کے کونے کونے میں ناچ ہوگا۔ زرینہ ناچے گی۔ ڈائریکٹر ناچے گا۔ تماشائی ناچیں گے روپیہ ناچے گا۔ روٹی ناچے گی اور پھر سب اوندھے منہ گر کر ہنسنے لگیں گے۔

"ہی ہی ہی ——" میں نے چونک کر دیکھا تو ابراہیم گھڑی ساز کسی بات پر ہنس رہا تھا اور ادھیڑ عمر عورت مسکرا رہی تھی۔ نوکر پھر لنگڑاتا ہوا اندر آیا اور پان دے کر چلا گیا۔ عورت آہستہ آہستہ پھر پان لگانے لگی۔ اور ابھی اس نے پہلا ہی پان طشتری میں رکھا تھا کہ معاً دروازے میں سے ایک جوان لڑکی ریشمی لباس پہنے ہوئے اندر آئی اور بے تکلفی سے عورت کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ ڈائریکٹر بیدار اور مسٹر دھنی جو تکیوں کا سہارا لئے بیٹھے تھے ایک دم چونک پڑے اور ان کی نگاہوں نے اتنی ہوشیاری اور سرعت سے اس کے بھرے بھرے جسم کو جانچا کہ میں حیران رہ گیا۔ لڑکی کا جسم پھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹ، رخسار آنکھیں اور ہاتھ تڑپ رہے تھے اور اعضائیں کچھ اس قسم کا تناؤ آنکھ مار رہا تھا کہ اس کا انگ انگ کمان کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ عورت سے زیادہ ایک ایسی کمان معلوم ہوتی تھی جسے دیکھتے ہی شکار کی خواہش جاگ اٹھے۔ مسٹر دھنی شکار کی خواہش سے شدید طور پر متاثر دکھائی دے رہے تھے کیونکہ ان کے ہونٹ جنھیں وہ دانتوں میں دبا دبا کر کسی انجان شے کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتے تھے لہو کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔

"کیوں جی آپ کو فلم لائن سے بھی کچھ دلچسپی ہے یا نہیں؟" ڈائریکٹر بیدار نے لڑکی کو پیاسی نظروں سے دیکھ کر دیکھا۔ لڑکی نے جواب دینے کی بجائے عورت کی طرف دیکھا اور وہ بولی۔

"جی کیا بتائیں۔ دلچسپی تو ہے مگر بات یہ ہے کہ فلم کی نوکری کا پیشہ کچھ یونہی سا ہے۔ وہاں نوکری کی سب سے بڑی قید ہے اور یہاں آزاد پیشہ ہے۔ جی چاہا ناچ کیا جی نہ چاہا نہ کیا اور —— مگر آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہ مشہور فلم ڈائریکٹر بیدار ہیں۔" خواجہ بہار اللہ نے ابراہیم گھڑی ساز کو گھور کر کہا۔ "بمبئی میں ان کی اپنی کمپنی ہے اور آج کل یہ اپنے تازہ فلم "بڑے باپ" کے لئے چند نئے چہروں کی تلاش میں آئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے اور ان کے مصنوعی دانت پھر چمک اٹھے۔

عورت نے مسکرا کر ڈائریکٹر بیدار کو دیکھا اور انھوں نے شاید اس کو ایک اچھا موقعہ سمجھ کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو یہاں پوری آزادی ہے مگر فلم لائن میں بھی تو کوئی خاص پابندی نہیں۔"

"پھر بھی نوکری تو ہے۔" عورت نے آخری پان طشتری میں رکھ کر لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور نوکری پوری قید ہے —— زرینہ بیٹی پان دے دو۔"

زرینہ طشتری لے کر اٹھی اور پان پیش کرنے لگی۔ اس کے جسم کی لرزشیں آہستہ آہستہ کروٹیں بدل رہی تھیں اور کمان تن رہی تھی۔ مسٹر ڈھی منے جو اس کے پاؤں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے میرے کان میں سرگوشی سے کہا۔ "کیا قیامت کی چال پائی ہے واللہ پہلی ہی فلم میں دیکھئے گا اعلیٰ درجہ کی فلم ستارہ بن جائے گی۔"

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔" ڈائریکٹر بیدار نے طشتری سے پان اٹھا کر آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ "فلم کی نوکری دراصل ایسی کوئی بری شے نہیں۔ ہم تو آرٹسٹ کے ماحول کو ہر لحاظ سے اچھا بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہیری کمپنی میں تو خاص طور پر آرٹسٹوں کے آرام اور فائدے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میرے تازہ فلم "کٹار" کی ہیروئن مس روفیہ سال بھر مفت تنخواہ پاتی رہیں۔" مسٹر دھنی جلدی سے بولے "اور اس عرصہ میں شاید وہ تنخواہ کے دن ہی اسٹوڈیو میں آتی تھیں۔ کہئے اس سے زیادہ اور کیا آزادی ہوگی؟"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں" زرینہ کی ماں پاندان سنبھالتے ہوئے بولی "مگر دیکھئے نا گو ابھی یہ بچی ہی ہے مگر اپنے کام میں اتنی ماہر ہے کہ ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار کما لینا اس کے لئے معمولی بات ہے اس لئے جب گھر بیٹھے ہی خدا سب کچھ دے دیتا ہے تو پھر فلم کمپنی میں ملازمت سے کیا فائدہ ہے؟"

"فائدہ؟" مسٹر دھنی جھک کر بولے۔ "اجی فلم لائن میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے وہاں انہیں روپیہ کے ساتھ ساتھ شہرت بھی نصیب ہو جائے گی۔"

"اجی شہرت تو اس کی اب بھی بہت ہے۔" زرینہ کی ماں نے بے نیازی کے ساتھ کہا۔ "خدا کے فضل سے جہاں جاتی ہے نام پیدا کرتی ہے۔"

"مگر یہ شہرت تو بہت محدود سی ہے۔" ڈائرکٹر بیدار منہ بنا کر بولے "اس بازار میں ہوگی اور زیادہ ہوگی تو اس شہر میں ہوگی بہت زیادہ ہوئی

تو دو چار اور شہروں میں ہو گی مگر فلم لائن میں تو یہ ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک مشہور ہو جائیں گی۔" اور انھوں نے زرینہ کو ایک بار پھر یوں دیکھا جیسے وہ ایک خوشبودار آم کی گٹھلی ہو۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں،" زرینہ کی ماں نے مصنوعی طور پہ مسکرا کر کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ جو لڑکی ایک بار فلم لائن میں چلی جائے وہ پھر کسی اور دھندے کی نہیں رہتی۔ اس لئے میں اسے وہاں بھیجنا پسند نہیں کرتی —— کوئی اور خدمت ہو تو کہیئے۔"

ڈائریکٹر بیدار نے کچھ کہنا چاہا مگر خواجہ بہار اللہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ اور مسٹر دھنی کی آنکھوں میں مایوسی جھلک آئی۔ ابراہیم گھڑی ساز ٹوپی کو ماتھے پر جھکا کر آئینہ دیکھنے لگا۔

"چلو بھئی" دفعتہً خواجہ بہار اللہ نے چھڑی سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے تو صاف انکار کر دیا۔"

"میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ بمبئی ضرور چلیئے۔" مسٹر دھنی نے آخری بار کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بڑا اچھا شہر ہے۔ گرد بہت کم اڑتی ہے۔ سڑکیں بہت صاف ستھری ہیں۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے اور سمندر کا کنارا ——"

زرینہ کی ماں مسکرانے لگی۔ اس کے پہلو میں زرینہ یوں خاموش بیٹھی تھی جیسے کاٹھ کی ایک خوبصورت

پتلی ہو۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زرینہ کی ماں رات کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تپلیاں نچانے والے تماشہ گر سے زیادہ مشابہ ہے۔

جب ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو خواجہ بہار اللہ نے زرینہ کی ماں کو اتنی موٹی گالی دی کہ اگر وہ سن پاتی تو فوراً کھڑکی سے جھولا تک لگا دیتی۔۔۔ سڑک پر حسب معمول چہل پہل تھی۔ لوگ بازار میں اس طرح چل رہے تھے جیسے ان کے ذہن مردہ ہو چکے ہوں۔ مجھے چاروں طرف آنکھوں کی گول گول پتلیاں نظر آ رہی تھیں۔ بھوکی آنکھیں جن میں ایک سستی سی شرارت چمک رہی تھی۔ بالاخانوں سے ہارمونیم اور ستار بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں پائلیں چھنک رہی تھی اور بہت سی کھڑکیوں پر لپٹے ہوئے پھول اونگھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم چپ چاپ چلتے رہے اور خواجہ بہار اللہ سڑک پر بیٹھ کر حجامت بنوانے والوں اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تماشبینوں کو دیکھ کر بڑبڑاتے رہے۔ میں اس بے جان سکوت کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر مسٹر دھنی سے پوچھا "کیوں بھئی اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ؟ بس یہی کہ علی محمد کباب والے کی دکان سے تلی ہوئی چانپیں کھائیں گے اور پھر اس سڑک کے دو تین چکر کاٹیں گے۔ شاید کوئی مچھلی ہاتھ آ جائے۔"

"مگر مچھلی کانٹے میں کس طرح پھنسے گی؟ تم معاملہ کی بات تو کسی سے

سے کرتے ہی نہیں"۔

مسٹر دھنی نے بڑے اطمینان سے کہا۔"اماں اس سمندر کی مچھلیاں خالی کانٹوں ہی پر دم دیتی ہیں۔ بس کانٹا ذرا چمکدار ہونا چاہیئے پھر دیکھو اچھی سے اچھی مچھلی لپکتی چلی آئے گی۔ ہم نے اپنی فلم کمپنی کے لئے کئی ایکٹر سیں اسی طرح پھانسی ہیں"۔

"یعنی ——؟

"یعنی یہ کہ آپ فلم لائن میں اس لئے آئیے کہ یہ ملک کی سب سے جاندار اور متحرک روشنی ہے۔ یہاں نام ملتا ہے۔ شہرت ملتی ہے۔ اور رہنے کو ایک اچھی جگہ یعنی بمبئی —— بمبئی بڑا اچھا شہر ہے۔ گرد بہت کم اُڑتی ہے۔ سڑکیں بے حد صاف ستھری ہیں۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے۔ اور سمندر کا کنارا ——" ابھی وہ کچھ اور کہنے والے تھے کہ یکایک علی محمد کبابیئے کی دکان آگئی اور وہ گفتگو چھوڑ کر تلی ہوئی چانپوں کی خوشبو سونگھنے لگے۔

جب ہم چانپیں کھا رہے تھے تو خواجہ بہاء اللہ نے ابراہیم گھڑی ساز سے کہا۔"بھئی اب کی ایسی جگہ لے چلو جہاں مال بھی اچھا ہو اور کام بھی جلدی بن جائے"۔

ابراہیم گھڑی ساز نے ایک سالم چانپ نگل کر انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا۔"بہت خوب" اور مسٹر دھنی ہڈی چچوڑتے ہوئے بولے"ہاں —— کوئی اچھی سی مچھلی"۔

"کوئی اچھی سی مچھلی"۔ میں نے سوچا"جو ان مکار شکاریوں کے خالی اور چمکدار کانٹے پر تیزی سے منہ مارے اور پھر تڑپ تڑپ کر دم توڑ دے۔ چمکدار کانٹے زیادہ دیر گدلے پانی ہی میں آنکھ مارتے ہیں —— سنہری آنکھ —— اور

مچھلیاں کھنچی چلی آتی ہیں۔ کمانیں تنتی ہیں اور شکار ہوتے ہیں۔ پھر شکاری مچھلیوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جاتے ہیں۔ بمبئی بڑا اچھا شہر ہے۔ گرد بہت کم اُڑتی ہے۔ سڑکیں بیحد صاف ستھری ہیں۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے اور سمندر کا کنارا ــــ اور سمندر کا کنارا شاید اگلی منزل کا پڑاؤ ہے۔ جہاں مچھلیوں کو ایک نئے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک آتشیں اور چنگاریوں بھرے دھارے پر جس میں مچھلیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں اور پھر سمندر کے کسی گمنام کنارے پر ان کی راکھ جمع ہوتی ہے۔ اور ایک بہت بڑا الاؤ جلنے لگتا ہے۔ اور مچھلیاں ہنسنے لگتی ہیں ــــ ہی ہی ہی ــــ"

یکایک ابراہیم گھڑی ساز خواجہ بہاء اللہ کی کسی بات پر اس زور سے ہنسا کہ کبابوں کی ایک پلیٹ اُلٹ گئی۔

"بھئی خلیفہ! آٹھ چانپیں اور دس کباب اور دینا ــــ" مسٹر دھنی پانی کا گھونٹ پی کر بولے۔

"ابھی لیجئے صاحب!" علی محمد پلیٹیں صاف کرتا ہوا بولا ــــ "ابھی لیجئے" اور اس نے آنکھ جھپکتے ہی چار پلیٹیں میز پر رکھ دیں۔

خواجہ بہاء اللہ سب سے پہلے دُکان سے نکلے اور جب وہ دس روپے کے نوٹ سے بچے ہوئے پیسے بٹوے میں ڈالتے ہوئے مڑے تو مجھے ان کا چہرہ بالکل نیا معلوم ہونے لگا۔ اُس مچھلی کی آنکھوں جیسا جو ابھی ابھی کانٹے کے ساتھ باہر آئی ہو ؟

⁂

اجنبی

اس نے آہستہ سے فلیٹ کی کھڑکی کھولی اور چوکھٹ پر جھک کر سڑک کو دیکھنے لگا۔ ابھی ابھی وہ بستر سے اُٹھا تھا اور معمول کے مطابق شب خوابی کے لباس ہی میں کھڑکی کی طرف چلا آیا تھا۔ سگریٹ جسے اس نے میز سے اُٹھا کر جلایا تھا اس کی اُنگلیوں میں آہستہ آہستہ سُلگ رہا تھا اور اس کا دھواں آسمانی رنگ کی ایک لطیف چادر کی طرح خمار آلود آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ کھڑکی کے نیچے کالی سڑک ہمیشہ کی طرح بازو پھیلائے لیٹی تھی اور اس کی سیاہ چھاتی پر انسانوں کا سیلاب خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ اسے یہ نظارہ بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا جب وہ نیند بھری آنکھوں سے کالی سڑک پر انسانوں

کے گروہ کے گروہ چپ چاپ رینگتے ہوئے دیکھتا تو دُنیا اِسے ایک مسلسل چل چلاؤ معلوم ہونے لگتی۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے وہ سیکڑوں اجنبی چہرے ہوا میں تیرتے ہوئے دیکھتا جو ایک ہلکی سی جھلک دِکھا کر ایسے غائب ہوتے کہ پھر کبھی ان کا کوئی پتا نہ چلتا۔ سڑک کے بازوؤں سے دم بھر کے لِئے نئی صورتیں اُبھرتیں اور چُپ چاپ یوں سیلاب میں غرق ہو جاتیں جیسے کسی ان جانے مقصد کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں اُتر گئی ہوں۔ اِنہیں یوں غائب ہوتے دیکھ کر اس کا دِل ایک عجیب قسم کی کیفیت سے لبریز ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ہر روز وہ کتنے چہرے ایسے دیکھتا ہے جو دُور سے مدھم اور بے رنگ دِکھائی دے کر ہمیشہ کے لِئے کھو جاتے ہیں اور وہ کبھی ان کی تازگی اور رعنائی کو مکمل طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہوتا کہ وُہ سڑک پر گُذرنے والی ہر صورت کو اچھی طرح دیکھ سکتا اور اس کی رعنائی اور تازگی کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتا تو شاید وہ زندگی بھر اس کے سوا اور کوئی کام نہ کرتا کہ ان رنگ برنگی صورتوں کو اپنے ذہن کے اُجلے طاقوں میں بڑی صفائی سے سجا کر رکھے اور ان کے درمیان ایک ایسی عجیب و غریب روشنی کا اہتمام کرے جس کی جوت میں ان کی شکلیں ابد تک تر و تازہ نظر آئیں مگر دقت اس کی آرزو کو چُپکے سے اپنے تاریک سینے میں اُتار لیتا اور اِسے اپنا ذہن ایک ایسا اندھیرا کباڑ خانہ معلوم ہونے لگتا جس میں بجھے اور ٹوٹے ہُوئے بے رنگ چہروں کے انبار لگے ہوئے ہوں۔ کئی بار اِس نے اس کباڑ خانے کا دروازہ کھول کر اندرونی صفائی کرنا چاہی مگر سامان کی زیادتی دیکھ کر وُہ گھبرا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کئی چہروں کو اُٹھا

کر دیکھا اور انہیں پہچاننے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر ٹوٹے پھوٹے اور بے رنگ تھے کہ وہ اِن میں سے ایک کو بھی شناخت نہ کر سکا۔ وہ سب کے سب اس کیلئے اتنے ہی اجنبی تھے جتنے سڑک پر گزرتے ہوئے راہگیر۔ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر دروازہ بند کر دیا۔ اس بات سے اسے بڑی گھن آتی تھی کہ اس کے ذہن میں ایک بھی صورت ایسی نہیں جو مکمل ہو اور جس کی نوک پلک کی صفائی پہ وہ ناز اور فخر کر سکے ایک ایسی صورت جو نگاہ میں آتے ہی تڑ سے بول اُٹھے ذرا میری چھب دیکھنا میرے ایسی بازار میں نہ مل سکے گی چنانچہ وہ جب بھی کھڑکی میں کھڑا ہوتا یہ خواہش دھیرے دھیرے اس کی رگوں میں سما جاتی اور اس کی نگاہیں کسی ایسے ستارے کی تلاش میں مصروف ہو جاتیں جو اس کے ذہن کو آسمانی روشنی سے اُجال دے۔ اس وقت وہ کھڑکی میں کھڑا کالی سڑک کو گھور رہا تھا اور اس کی آنکھیں سڑک کی سیاہ چھاتی پر رینگتے ہوئے انسانوں کے درمیان اپنی آرزو کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ لوگ خاموشی سے قدم اٹھا رہے تھے اور ان کی دھندلی آنکھوں میں ایک بے جان ٹھہراؤ کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے وہ ایسے کھلونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جن کی چابی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہو اور وہ عنقریب رُک کر گرنے والے ہوں مگر اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلتے جاتے اور سڑک کے بازوؤں میں گم ہو جاتے۔ ان کے بوجھل قدموں کا اُبھار اور مُردہ آنکھوں کا ٹھہراؤ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زندگی سے تنگ آ کر خود بخود دفن ہونے کیلئے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ دیر تک کھڑا اس نفرت انگیز ماحول کو دیکھتا رہا اور جب

تھک گیا تو واپس آ کر اس نے کپڑے پہنے اور فلیٹ سے نیچے اُترنے لگا۔ سڑک پر پہنچ کر وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوا جو اس کی کھڑکی کے عین نیچے واقع تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگا۔ جس جگہ وہ بیٹھا تھا اس کے سامنے چوکور ستون کے ساتھ لگے ہوئے آئینے میں ہوٹل کا مالک پتھر کے بُت کی طرح میز پر بیٹھا دِکھائی دے رہا تھا۔ اس میں زندگی کے آثار بالکل مفقود تھے۔ کبھی کبھی جب وُہ گاہکوں سے پیسے وصُول کرتے وقت یکایک غرّانے لگتا یا نوکروں کو فحش گالیاں دیتا تو یُوں معلوم ہوتا جیسے اس کے پتھریلے جسم میں شگاف پیدا ہو رہے ہیں جو تھوڑی دیر میں اِتنے وسیع ہو جائیں گے کہ اس کا جسم ریزہ ریزہ ہو کر گِر پڑے گا مگر جب وُہ خاموش ہو جاتا تو اس کے ہر عُضو کی حرکت مر جاتی اور چہرے پر پہلا سا دھندلا پن اپنا جال بُن دیتا۔ ہوٹل میں کام کرنے والے نوکر آہستہ آہستہ چائے کی پیالیاں اور کیک میزوں پر رکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ابھی تک نیند جھانک رہی تھی۔ ہوٹل کے ایک کونے میں پڑا ہوا ریڈیو اپنے سینے سے اتنی دردناک سُریں نکال رہا تھا کہ اسے ایک لمحے کیلئے زِندگی کی حرکت اور مُسرت کی بربادی کا احساس ہوا۔ اپنے آس پاس کی ہر چیز میں اِسے کسی شے کی کمی نظر آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگا کہ یہ کمی فضا ایک ایسی سڑاند پیدا کر رہی ہے جو گلتی اور سڑتی ہوئی لاشوں کی بدبُو سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہے۔ ہوٹل کے مالک کے چہرے کا دُھندلا پن اور نوکروں کے بوجھل قدم اور نیند سے دبی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا احساس زیادہ شدید ہو گیا۔ اور اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کر کے اِتنے

بید لگائے کہ ان کی ساری مُردنی اور بے کیفی رفوچکر ہو جائے اور ہوٹل کی بیجان فضا میں ایک ایسا ہمہمہ پیدا ہو جس سے سارے انسانوں میں زندگی کی تابندہ رُوح جاگ اُٹھے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک ہوٹل کے مالک کے غرّانے کی آواز آئی اور پھر گالیوں کی بوچھاڑ سنائی دی۔

"اُلّو کے پٹھے پھر پیالی توڑ دی۔ بتلا اب تیرا باپ اسے خرید کر لائے گا۔ اگر آئندہ ایسا ہوُا تو کان پکڑ کر باہر نکال دُونگا۔ یاد رکھنا ——"

نوکر نے گالیاں یُوں وصُول کیں جیسے اسے کسی اچھی خدمت کے صلے میں داد ملی ہو اور وہ میز سے پیالیاں اُٹھا کر سماوار کی طرف بھاگا۔ ہوٹل کا مالک پھر پتھر کی طرح ساکت ہو گیا۔ وہ اس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ پر بہت حیران ہوُا اور اس نے سوچا کہ اس سنگین مجسمے میں بھی دم بھر کے لیئے زندگی محض اس لئے اُبھر آئی کہ اس نے پیالی ٹوٹنے میں اپنے لیئے ایک خطرہ محسُوس کیا۔ وہ چائے کی ایک حقیر سی پیالی کے نقصان کو اس لیئے برداشت نہ کر سکا کہ وہ اس کی اپنی ملکیت تھی اور اپنی ملکیت کی چیزوں کی تباہی اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھی چنانچہ اس کی تنبیہ میں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیئے اچھے یا بُرے قدم اُٹھانے کا جوش تھا اور یہ جوش ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر ایسی روشنی لے آیا تھا جس سے آئینے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ چائے کی ایک چھوٹی سی پیالی کے ٹکڑے اس کی رُوح کے کسی تاریک کونے سے وُہ چنگاری کھینچ لائے تھے جو مُدت سے مایوس اور اُداس وقت کا انتظار کر رہی تھی مگر اس چنگاری کی چمک صرف لمحہ بھر رہی شاید اس لیئے کہ اس کا مقصد بہت چھوٹا تھا اور اسے مکمّل طور پر استعمال

نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے ایک بار ہوٹل کے مالک کے چہرے کو آئینے میں بڑے غور سے دیکھا۔ مگر اس پر چھایا ہوا دھندلا پن اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ وہ روشنی جو ابھی ابھی اس نے دیکھی تھی اس بجلی کی طرح نکلی جو سیاہ بادلوں کے سینے میں ایکا ایکی تڑپ کر غائب ہو جائے وہ چمک —— اس نے سوچا۔ اپنی ملکیت کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر نفرت اور انتقام کی وہ چمک —— اگر اس مُلک کے ہر باشندے کے چہرے پر پیدا ہو جائے۔ تو کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وہ چمک وہ کارگر چمک جو ایک بڑے مقصد کے لیئے بجلی کی شکل اختیار کر لے اور وہ بجلی اپنی پوری قوت سے ماحول پر جھپٹ پڑے اور پھر شائد اس ٹھہراؤ اور نامردی کا بھی خاتمہ ہو جائے جس کی وجہ سے کروڑوں انسانوں کی آبادی تعفن اور اُکتا دینے والی بدبو میں سانس لے رہی ہے۔ یکایک نوکر نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور وہ چونک پڑا۔ گرم چائے کے گھونٹ اسے بہت فرحت بخش معلوم ہوئے اور اس نے پیالی ہاتھ سے رکھ کر ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لیا۔ چند ہی لمحوں میں ہوٹل کی حالت بہت کچھ بدل چکی تھی ریڈیو کی اداس سُریں مر چکی تھیں اور ان کی بجائے ایک تیز اور امید افزا نغمہ بلند ہو رہا تھا۔ نوکروں کی چلت پھرت میں سرعت پیدا ہو گئی تھی اور سڑک کے بیچوں بیچ ایک گڑگڑاتی ہوئی ٹریم ہوا سے سرگوشیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا میں غیر معمولی حرکت اور زندگی پیدا ہو گئی ہے چنانچہ اسے کچھ تسکین سی ہونے لگی مگر ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے چار آدمیوں کی گفتگو سُن کر اسے یوں معلوم ہوا جیسے وُہ چپکے چپکے ایک ایسا بند باندھنے میں مصروف

ہیں۔جس سے فضا کی ساری حرکت زندگی اور دھڑکن کے رُک جانے کا اندیشہ ہے۔ ان میں سے دو سیاسی ورکر ایک شاعر اور ایک کسی روزانہ اخبار کے ایڈیٹر تھے مگر چاروں کی آنکھوں میں اندرونی جوہر کی چمک کی بجائے وہی بے جان ٹھہراؤ اور دُھندلاپن تھا جس سے مایوسی اور شکست ٹپک رہی تھی۔ چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھی ہُوئی تھیں اور وہ ایک ایک گھُونٹ پیتے ہُوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں بھی موت کا سا کھوکھلاپن جھلک رہا تھا اور جب کبھی وہ اپنی گفتگو کے دوران میں امید کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھوں میں یُوں روشنی چمکتی جیسے مُردوں کی ہڈیوں سے فاسفورس پیدا ہو رہا ہو ——

"آج کل کی سیاست کیا ہے بھئی۔ ایک منظّم دھوکہ بازی ہے" ایک سیاسی ورکر نے جمائی لیتے ہُوئے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں کیا نہ کریں۔ میں تو سوچ رہا ہُوں کہ اب یہ دھندا ہی چھوڑ دُوں تو بہتر ہے"——

"ارے بھئی یہ کیوں۔ بنی بنائی عزت کیوں بگاڑتے ہو" دُوسرے سیاسی ورکر نے پتلیاں نچا کر کہا "جیسے پہلے وعظ کرتے تھے اب بھی کرتے رہو۔ آخر سیاست میں ایمانداری کا موقعہ ہی کونسا ہے۔ میں تو اس اصول کا قائل ہُوں کہ کسی نہ کسی طرح خلقِ خدا کو جھگڑنے میں مشغول رکھو تاکہ تمہاری قیادت زندہ رہے"۔

"تو اور یہاں تمام عمر کرتے کیا رہے ہیں۔ انہی مشغلوں سے تو اتنی دیر پیٹ بھرنے کا سلسلہ چلتا رہا مگر بات یہ ہے بھئی کہ اب اس قسم کی دھوکہ بازی کو دِل نہیں چاہتا"—— پہلے سیاسی ورکر نے کچھ بے اطمینانی سے کہا۔

"دل کی پسند کی بھی ایک ہی رہی"۔ اخبار کے ایڈیٹر کندھے تول کر بولے۔ "آپ میری مثال ہی لیجیئے۔ کیا میرا دل چاہتا ہے کہ میں دنیا کے موجودہ نظام کی مدح میں قصیدے لکھتا رہوں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ آج ہمارے ملک میں ذلت اور قومی بربادی کے جو بھیانک واقعات پیش آرہے ہیں ان کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا میں اس سے بے خبر ہوں کہ کروڑوں انسانوں کی شرمناک خاموشی کا حاصل کیا ہے؟ کیا میں اس وسیع پیمانے کی خودکشی کو ملک کے لئے نیک فال سمجھتا ہوں اور میرا جگر اس شکست پہ خون نہیں ہوتا؟ مگر مجبوری ہے یہاں کے لوگ ابھی اتنے سمجھدار نہیں ہوئے کہ اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکیں دور کیوں جائیے اس کے باوجود کہ میں دن رات اپنے آقاؤں کے حق میں دست بدعا ہوں۔ میرے اخبار کی اشاعت میں ذرہ بھر کمی نہیں ہوئی بلکہ اس طریقے سے اُلٹا میں بھوکوں مرنے سے بچ گیا ہوں۔"

"کاش اس ملک میں انسان آباد ہوتے" شاعر نے میز پر کہنیاں ٹیک کر کہا۔ "اور وہ یہ سوچ سکتے کہ زندگی مجبوری اور بے بسی کا اشتہار نہیں بلکہ حرکت و عمل کا نام ہے۔ میں جب بازاروں میں ان زندہ لاشوں کو قدم اُٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری شاعری فنا ہو جاتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان اس ملک سے اپنے خیمے اُکھاڑ کر ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکا ہے اور اپنے پیچھے زمین کو بہلانے کی خاطر ان لاشوں کو چھوڑ گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی ہڈیوں سے بھی شعلے نکلنے لگیں گے اور اس سرزمین پر آگ دھوئیں اور خاموشی کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔"

"کیا میں اِن باتوں کو اپنے اخبار میں لکھ سکتا ہُوں۔" ایڈیٹر نے جیسے محویت میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

"یہ وہ زندہ حقیقتیں ہیں جو ہمارے دماغوں میں خودرو پودوں کی طرح اُگ آتی ہیں" شاعر نے چائے کی پیالی میز سے اُٹھاتے ہُوئے کہا۔ ہمیں اِن کے متعلق سوچنا نہیں پڑتا کیونکہ جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے وہ اِن پودوں کو تناور پیڑ بننے میں مدد دے رہا ہے۔ یہ پودے اور پیڑ صحت مند زندگی کی علامت ہیں مگر یہاں اِن کی نمائش گناہ ہے اور اِس کی پاداش میں زیادہ نہیں صرف تمہارے اخبار کی اشاعت ممنوع قرار دی جائیگی اور تمہیں اجازت ہوگی کہ فاقوں سے تنگ آکر جب جی چاہے خودکشی کرلو۔"

"تو پھر بھئی —— آخر کیا کیا جائے" پہلے سیاہی دُور کرنے جاتی ہیکر ایک طویل سانس کھینچی اور جیب میں سگریٹ ٹٹولنے لگا۔

"یہ کوئی سوال نہیں" دوسرے سیاہی دور کرنے میز پہ جُھک کر کہا۔ جو کچھ کر رہے ہو کیئے جاؤ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں ہم محسُوس کرنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتے۔ زندہ حقیقتیں ہمیں خُون کے آنسو رُلا رہی ہیں۔ ہمارے دماغوں میں زندگی کے صحت مند پودے نمائش کیلئے بیتاب ہیں مگر ابھی اِن کے اور ہمارے درمیان ایک پردہ حائل ہے اور ہم میں اس پردے کو چاک کرنے کی جرأت نہیں یہ ایک خطرناک کمی ہے اور جب تک یہ کمی پوری نہ ہوگی ہر قسم کا تخئیل اور سوچ بیکار ہے اس لئے حضرات جو کچھ آپ کر رہے ہیں اُسی میں چپ چاپ مشغول رہئے اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھئے اور ساتھ ہی اس خاکسار کو بھی اجازت بخشئے کیونکہ مجھے ابھی رات کے جلسے کی تقریر کیلئے ریہرسل کرنا ہے۔"

ابھی وہ اپنی چھڑی سنبھال ہی رہا تھا کہ اس کے تینوں ساتھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وُہ چاروں چُپ چاپ ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ وہ ان کے جا چکنے کے بعد کچھ دیر تک وہیں بیٹھا ان کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان میں سے دو سیاسی ورکر ایک شاعر اور ایک ایڈیٹر تھے اور یہ چاروں آدمی اپنے سینے میں ایک کڑے درد کی موجودگی تسلیم کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اس درد کا درماں کیا ہے مگر چونکہ انہیں اپنے اندر جرأت کی کمی نظر آتی تھی۔ اس لئے وہ عمل سے کنّی کاٹتے تھے۔ اسے ان لوگوں کی حالت عوام سے زیادہ قابلِ رحم نظر آئی اور اس نے سوچا کہ وُہ ایک ایسے پُل کے کنارے پر کھڑے ہیں جو ٹوٹی پھُوٹی ہڈیوں سے بنا ہوا جھُول رہا ہے اور اس کے دُوسرے کناروں پر نئی بستیاں ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں اور ان دونوں کے درمیان پُل کے نیچے ایک گہرا غار مُنہ کھولے کھڑا ہے۔ تاکہ پل پر جمے ہوئے سیاہ خون پر پھسلتے ہُوئے انسانوں کو اپنے تاریک سینے میں پناہ دے۔ کیا وہ ہڈیوں کے پُل کو عبور کریں گے؟ کیا وہ پُل کے دُوسرے کنارے پر ستاروں کی طرح چمکتی ہُوئی بستیوں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ خود بھی ایک ستارہ بن جائیں یا وہ خطرے سے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے۔ اس کے ذہن میں ایسے ہی کئی خیالات اُبھرے مگر اسے ایک کا بھی تسلی بخش جواب نہ ملا اور اسے اپنا ذہن ایک ایسا تاریک آسمان معلوم ہونے لگا جس کے ستاروں کی کرنیں ہمیشہ کے لئے بُجھ چکی ہوں۔

ہوٹل میں اب زیادہ بھیڑ ہو چلی تھی اس لئے آوازوں میں زیادتی اور

شدّت پیدا ہو گئی تھی۔ چائے کے برتن کھنک رہے تھے۔ نوکروں کے میل سے بھرے ہوئے ہاتھ میزوں کو صاف کر رہے تھے پیالیاں چھلک رہی تھیں۔ سگریٹ سُلگ رہے تھے اور ریڈیو پر فرمائشی ریکارڈ بج رہے تھے۔ اس نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا اور ہوٹل کی افسردہ فضا سے نکل کر جو ہما ہمی کے باوجود بیمار اور بے رنگ معلوم ہوتی تھی اپنے فلیٹ کی طرف ہو لیا۔ جب وُہ سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو معاً اُسے خیال آیا کہ اگر وُہ مجسّمہ سازی کا ایک کارخانہ کھول لے اور سڑک پر گزرنے والے ہر آدمی کے گلے میں مندرجہ ذیل عبارت کی تختی لٹکا دے۔

واسو گریوا مجسّمہ ساز کا کارخانہ۔

یہاں سو سال تک محفوظ رہنے والے بُت بنائے جاتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

تو اسے چلتے پھرتے اور بولتے اشتہاروں کی کمی نہ رہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے ہوٹل کا مالک یاد آ گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے کبھی واقعی کوئی ایسا کارخانہ کھولا تو اسے چلتے پھرتے اشتہاروں کے صیغے کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دے گا۔ جب وُہ سیڑھیاں طے کر کے اپنے فلیٹ کی طرف مُڑا تو اسے اپنے ذہن میں ایک منجمد تاریکی کا احساس ہؤا جس کے بیرنگ سائے اس کے خیالات پر پھیل رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو کر پھر اسی کھڑکی میں جا کھڑا ہؤا۔ کالی سڑک پر انسانوں کے گروہ کے گروہ چُپ چاپ رینگ رہے تھے۔ ان کے بوجھل قدموں کا اُبھار

اور مُردہ آنکھوں کا ٹھہراؤ دیکھ کر یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے وُہ زندگی سے تنگ آکر خُود بخُود دفن ہونے کے لیئے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اسے اپنے اندر ایک سوگوار خلا محسُوس ہونے لگا اور وُہ کوشش کے باوجُود اس کو پُر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سڑک پر گزرتے ہُوئے تمام لوگ اس کے لیئے اجنبی تھے۔ اُن کے چہرے زندگی کی حرارت سے محرُوم تھے ان کی آنکھوں میں رُوح کی چمک مفقُود تھی اور ان کی تھکی ہُوئی چال سے اس کی اُمیدوں پر برف گر رہی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھنا اور چھُونا چاہتا تھا اس کی ایک جھلک بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اسے بھڑکتے ہُوئے شعلوں کی تلاش تھی مگر اس کے سامنے راکھ کا ایک ڈھیر تھا جس میں کہیں کہیں چنگاریاں دہک رہی تھیں مگر اُن میں شعلہ بننے کی سکت نہیں تھی۔ راکھ کے ڈھیر میں وہ یُوں مُنہ چھُپائے لیٹی تھیں جیسے اپنی رہی سہی چمک پر شرمندہ ہوں۔ اس نے ایک بار پھر سڑک پر رینگتے ہُوئے انسانوں کو غور سے دیکھا مگر کسی چہرے میں اسے اپنی اُمیدوں کا رنگ جھلکتا نظر نہ آیا۔ وہ مایُوس ہو کر کھڑکی سے ہٹ آیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مایُوسی نے اسے اتنا بیزار کر دیا تھا کہ اسے کمرے کی ہر ایک چیز اجنبی معلُوم ہو رہی تھی حالانکہ وہ انہیں ہر وقت استعمال کرنے کا عادی تھا مگر اس وقت اسے یُوں معلُوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی یہاں لا کر رکھی گئی ہیں۔ اس نے کئی بار ان چیزوں کو دیکھا اور اس کی نفرت بڑھتی چلی گئی۔ "یہ چیزیں" اُس نے سوچا "یہ تمام چیزیں اجنبی ہیں کیونکہ یہ بے جان ہیں ان میں چمک دمک نہیں اس لیئے مجھے انہیں یہاں سے اُٹھوا دینا چاہیئے

ابھی اُٹھوا دینا چاہئے"۔ وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا مگر یکایک رُک گیا۔" یہ چیزیں میں یہاں سے کیوں اُٹھوا دینا چاہتا ہُوں"۔ اس نے پھر سوچا" کیونکہ یہ بے جان ہیں بے رنگ ہیں ان میں چمک دمک نہیں مگر ——— مگر یہاں کونسی چیز جاندار ہے۔ اس کمرے اور اس شہر سے لیکر اس مُلک کے آخری حصّۂ زمین تک کس کے سینے میں صحت مند دل دھڑک رہا ہے۔ یہاں کوئی بھی زندہ نہیں۔ اس دیس کی سڑکوں پر چلتے ہوئے راہ گیر سیاسی ورکر ایڈیٹر اور شاعر سب زندہ لاشیں ہیں ان کے کھوکھلے سینوں میں مُردہ دل تیر رہے ہیں۔ ان میں زندگی کی دھڑکن رُوپ اور چمک دمک نہیں۔ اس لئے وہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور اگر میں اس کمرے کی چیزیں محض اس لئے اُٹھوا رہا ہُوں کہ وُہ بے رنگ اور بیجان ہونے کے باعث اجنبی معلوم ہوتی ہیں تو پھر ——— تو پھر ———"

اس لمحے اسے ایسا محسُوس ہُؤا جیسے وہ چوری کرتے ہُوئے پکڑا گیا ہو اور وُہ گھبرا کر تیزی سے ٹہلنے لگا۔ لکھنے والی میز اور دروازے کے درمیانی فاصلے میں اس نے کئی چکر لگائے مگر اس کی گھبراہٹ میں کوئی کمی واقع نہ ہُوئی آخر کار اس نے تنگ آ کر میز سے سگریٹ اُٹھایا اور جب وُہ اسے جلا کر واپس مُڑنے لگا تو اچانک اس کی نگاہ دیوار کے ساتھ لگے ہُوئے آئینے میں پڑی اور ——— آئینے کے عین درمیان میں ایک درخشندہ اور تاباں ستارہ چمکنے سے نمودار ہُؤا اور یکایک پھُوٹ کر رنگ برنگ کرنوں میں تبدیل ہو گیا اور ان کی مدھم جوت میں آئینے کی سطح پر اس کا اپنا چہرہ اُبھر آیا ———

رُوحِ زندگی کی غیر فانی چمک اور اُمنگ سے لبریز چہرہ جس پہ ابدی مسرّتوں کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں —— اور اسے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس نظارے سے اس کے دِل میں ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک پیدا ہو رہی ہے ——

وصیّت نامہ

(کل رات میں نے خواب دیکھا کہ میں مر چکا ہوں، ایک تاریک کمرے میں میرا سرد اور بیجان جسم چارپائی پر تنہا پڑا ہے، اور ساتھ والے کمرے میں مُلک کے تمام بڑے افسانہ نگار اور شاعر جمع ہو کر ایک وصیت نامہ سُن رہے ہیں جو شاید میں نے خودکشی سے قبل لکھ کر اپنے ایک شاعر دوست کو بھیج دیا تھا، مجھے اس وصیّت نامے کے کچھ حصّے یاد رہ گئے ہیں اور اس وقت جبکہ میں انہیں لکھ رہا ہوں، میری نگاہوں میں وہ آنسو کانپ رہے ہیں جو یہ وصیت نامہ سُنتے وقت حاضرین کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے)

"جس وقت یہ تحریر پڑھی جائے گی، اس وقت میرا چہرہ بے رونق

اور میری آنکھیں بے نور ہو چکی ہونگی، وہ آنکھیں جو عمر بھر زندگی پر موت کے خونخوار حملوں کا نظارہ دیکھتی رہیں، جن کے لیئے حُسن ایک سراب رہا اور بدصورتی ایک تلخ حقیقت، اور یہ تلخ حقیقت میرے دِل میں زہریلے کانٹے کی طرح اُترتی چلی گئی، اور آخر کار اس نے ایک صدق و خلوص سے معمور اور مظلوم انسانیت کی بے بسی سے بیچین و مضطرب رُوح کا خاتمہ کر دیا۔ بدصورتی کی دیوی کے مندر میں پھر وحشی قہقہے گُونج اُٹھے اور سینکڑوں گھنٹوں کی ٹھناٹھن میں اس نے اپنی قربانگاہ پر ایک اور نذر لی۔ مُلک کے ایک انصاف پسند اور انسان دوست افسانہ نگار کی ۔۔ ایک ایسے انسان کی جو زندگی بھر غلامی ظلم اور افلاس کے خلاف دلیری سے لڑتا رہا اور بالآخر اسی جدوجہد میں اس نے خُونیں پھُولوں کا سہرا سجا کر موت کی دُلہن کو اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہُوں۔ رات کی تاریکی اور بھی گہری ہو گئی ہے۔ مجھے کھڑکی میں سے سیاہ بادل چُپ چاپ زمین کو گھُورتے ہُوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ میری میز پر موم بتی کے ایک ٹمٹماتے ہُوئے شعلے کے علاوہ اور کہیں روشنی کا نشان نظر نہیں آتا۔ شاید بجلی بھی سو چکی ہے۔ آہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی گھنگھور اندھیری گھٹاؤں میں مَیں کب سے بجلی کی کڑک کا انتظار کر رہا ہوں اور اس روشنی سے میری کتنی بہترین آرزوئیں وابستہ ہیں جو بجلی کی کڑک کے بعد پیدا ہوگی۔ وہ روشنی جو کروڑوں آتش کدوں کا جوہر ہوگی اور جس کی چمک پڑتے ہی زمین پر بے شمار سیاہ خانے جل اُٹھیں گے۔ یہ دُنیا راکھ کا ڈھیر بنے گی اور اس راکھ سے ایک نئی دُنیا جنم لے گی جس کی فضا میں انسان ستاروں کے

گیت گایا کرے گا، کاش میری غم نصیب آنکھیں جنہوں نے اس دنیا میں بدصورتی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا اس حسن دلآرا کو دیکھ سکتیں، اسے چھو سکتیں، محسوس کر سکتیں۔ مگر نہیں ابھی منزل دور ہے اور میں زخموں سے چور ہو رہا ہوں۔ آسمان کے آنسو ٹوٹے ہوئے تاروں کی صورت میں ٹپک رہے ہیں۔ ہوا کا ماتمی راگ شروع ہو گیا ہے اور کئی ان جانی آوازیں کہکشاں کی پُراسرار وادیوں سے مجھے بُلا رہی ہیں۔ اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اپنی یاد میں میں صرف وہ افسانے چھوڑ رہا ہوں۔ جنہیں میں نے خونِ جگر سے لکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک ادب کی کیاری ہری بھری رہے گی لہو کے یہ چھینٹے ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے ....

میں جانتا ہوں کہ میری خودکشی پر کئی لوگ یہ کہیں گے کہ میں بزدل تھا، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں، مجھے معلوم ہے کہ مجھ پر بزدلی کا الزام دھرنے والے خود کس قدر دلیر اور بہادر ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں انسانیت کے بچاؤ کے مورچوں میں لڑتا ہوا مر رہا ہوں۔ میں اس حالت میں جان دے رہا ہوں کہ میرا جسم بھوک سے نڈھال ہو چکا ہے مگر میرے ہاتھوں نے بندوق کو اور بھی بھینچ لیا ہے تا کہ نشانہ خطا نہ جائے۔ میں نے اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے زندگی کی مردانہ وار لڑائی سے منہ نہیں موڑا۔ میں ایک سچا سپاہی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میرا ضمیر ہمیشہ ہشیار اور روشن رہتا ہے۔ اسے کوئی نہیں خرید سکتا کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ میری موت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔ اور ان گرد نوردِ مجاہدوں کی راہنمائی کرے گا جو آزادی اور مساوات کے گیت گاتے ہوئے آگے

بڑھیں گے۔ ....

مجھے اُن لوگوں پر رحم آتا ہے جنہوں نے وقتی مسرّت کے لیے اپنے آپ کو تاریک موریوں میں گرا دیا ہے۔ وہ لوگ جو کل تک آزادی و مساوات کے گیت گاتے تھے اُن کے ہونٹوں پر آج خاموشی کے پہرے ہیں۔ ان کی رُوح چاندی کی چٹانوں کے نیچے پس چکی ہے۔ اُن کے ذہن میں پگھلا ہوا سونا تیر رہا ہے! اب وُہ خاموش ہیں، کبھی وہ عشق کے نغمے چھیڑتے ہیں اور کبھی حسن کے گیت گاتے ہیں مگر حسن کہاں ہے؟ آہ اُنہوں نے اپنی بہترین آرزوؤں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور اب وہ ان کی یاد کو بھی بھول جانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بُزدلی نہیں کیا یہ فرار نہیں، زندگی کے اصلی مورچوں کے مفرور اب ظلم و جبر کے دیوتاؤں کے مندروں میں بھیک مانگ رہے ہیں، ان سیاہ خانوں کے دروازوں پر وہ اپنے کچکول پھیلائے کھڑے ہیں اور وحشی دیوتاؤں کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ کاش وہ اب بھی اپنے دِل میں اُس احساس کی لرزش محسوس کرسکیں جس نے جنم لیتے ہی اُن کے آنسوؤں میں لہو کے چھینٹے دئے تھے اور انہیں سچے مقصد کے لئے لڑنا سکھایا تھا، مگر شاید اب یہ ممکن نہیں۔ انسانی ضمیر پر سب سے زیادہ نازک وقت وہ ہوتا ہے جب وُہ اپنی قدروں کا معیار بدلتا ہے۔ ستاروں کی طرف یا پاتال میں۔ منزل کے تصور کا فیصلہ زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ اور اگر اس وقت انسان کے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو پھر اس کا سنبھلنا بے حد مشکل ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس بلا کا شکار نہیں ہوا۔ میرے عزم نے اِس نازک مرحلے پر میری راہنمائی کی، میری رُوح کے کونے کونے سے آزادی و مساوات کا مبارک

نعرہ گونجا اور میں نے اِس صدائے حق کو لبیک کہا اور آج جبکہ میں زندگی بھر اسی سچے مقصد کے حصول کے لئے لڑتا ہوا مر رہا ہوں مجھے پورا اطمینان ہے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے میرے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے اور میرے دل میں خوف کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ....

اس وقت میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں لوہا کٹنے اور زنجیریں ٹوٹنے کی آوازیں سُن رہا ہوں۔ شاید میرے نعروں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اب میری موت اس عمل کو اور بھی تیز کر دے گی۔ کل ساری دُنیا جان لے گی کہ مَیں انسانیت کے لئے قربان ہو گیا ہوں۔ میرے لہو کا ایک ایک قطرہ سُرخ بہار کی آمد کا پیام دے گا۔ میری کمزور ہڈیاں تڑخ کر آنے والے انقلاب کا اعلان کریں گی۔ اِس انقلاب کا، جس کو برپا کرنے کے لئے میں نے موت کے مندر میں زندگی کے محبوب ترین پھول تک کا تحفہ پیش کر دیا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آزادی اور مساوات کے مورچوں پر لڑنے والے تمام سپاہی آنے والے انقلاب کو اسی قسم کی سلامی دیں ——

....

میں چاہتا تو اپنا ضمیر بیچ کر عیش و آرام کی دلدل پر پھولوں کی سیج بچھا سکتا تھا۔ مگر میں سپاہی ہوں، آزادی اور مساوات کے مورچوں کا سپاہی۔ میرے ضمیر کا تقاضا تھا کہ میں بدبودار پھولوں کو سونگھنے کی بجائے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں مگر اپنے مورچوں کو نہ چھوڑوں چنانچہ میں نے یہی کیا اور اِس وقت بھی جبکہ میں مر رہا ہوں۔ میری بندوق جوشِ غضب سے

میرے ہاتھوں میں کانپ رہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میں اس طرح کیوں مر رہا ہوں کیونکہ یہ ایک مردانہ وار لڑائی کا نتیجہ ہے اور ایک بدترین زندگی کے سینے پر ایک اچھی موت کا کاری وار ــــــ اور مجھے اس بات کی پروا بھی نہیں کہ لوگ میرے متعلق کیا خیال کریں گے ــــ مجھے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں نے راہِ طلب سے مُنہ نہیں موڑا۔ اور موت کے قہقہوں سے سہم کر کسی گندی موری میں نہیں جا گرا۔ میں مسکراتا ہوا موت کے مندر میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ میری رُوح اندھیرے بادلوں میں پہنچ کر بجلی بن کر کڑکے گی اور اس سے وہ چمک پیدا ہوگی جس کا میں زندگی بھر منتظر رہا۔ وہ وقت کس قدر مقدس ہوگا جبکہ میں خود ہی چمک کر اپنا تماشا آپ دیکھوں گا۔ مَیں چاہتا ہوں (اور اسے میری وصیت سمجھا جائے) کہ آزادی اور مساوات کے مورچوں پر لڑنے والے تمام سپاہی آنیوالے انقلاب کی سلامی میں زندگی کے پھولوں کا تحفہ پیش کریں ــــ جب وہ آزادی اور مساوات کے گیت گاتے ہوئے موت کے مندر میں داخل ہوں گے تو موت کا چہرہ زرد پڑ جائے گا اور اندھیرے بادل بجلیوں سے بھر جائیں گے یہ بجلیاں ہر طرف کوندتی پھریں گی اور ان کی کڑک اور چمک سے چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل جائے گی، اور جب یہ دُنیا جل کر راکھ ہو چکے گی تو پھر مضبوط اور جفاکش ہاتھ ایک نئی دُنیا کو جنم دیں گے جس کے کناروں پر آزادی اور مساوات کی قندیلیں ابد تک جلتی رہیں گی ــــ

اندھیرا

"مجھے چھوڑ دو میں مرنا چاہتا ہوں"۔

وارڈ نمبر دس کے مریض نے چیخ کر کہا۔ اور نرس جو اس کے زخمی سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کر رہی تھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مریض نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خون میں رچی ہوئی پٹی کو سر سے نوچا اور فرش پر پھینک دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی انگلیاں تازہ لہو میں لتھڑ کر سرخ ہو گئیں اور جب اس نے کسی نامعلوم جلن سے بیتاب ہو کر وہی انگلیاں اپنے گالوں پر جو درد اور غصے کی وجہ سے سیاہ پڑ گئے تھے پھیریں تو اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا۔

"میں مرنا چاہتا ہوں"۔ اس نے کسی انجانی ہستی سے مخاطب ہو کر اپنے

الفاظ دُہرائے:"میں یہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ اس اندھیرے سے موت بہتر ہے"۔ اور اچانک اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلی ہو گئیں۔ اور اس نے پہلو میں پڑے ہوئے تکیے کو بھینچ کر پلکیں بند کر لیں سلیٹی۔ رنگ کی چھوٹی سی میز کے قریب خوفزدہ نرس سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب مریض دو چار منٹ تک اسی حالت میں پڑا رہا تو وہ گھبرا کر تیزی سے مُڑی اور کمرے کے سیاہ دروازے کو کھول کر ڈاکٹر کی طرف یوں دوڑی جیسے مریض بستر سے اُٹھ کر اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں بالکل خاموشی طاری رہی اور بجلی کی بتی کی تیز روشنی چپ چاپ مریض کے گالوں پر کانپتے ہوئے آنسوؤں اور خون کے داغوں کو چمکاتی رہی۔ جب دوبارہ کمرے کا دروازہ کھُلا تو ہسپتال کا انچارج ڈاکٹر رام ناتھ سیاہ فریم کی عینک کو اپنی گدھ کی سی ناک پر جماتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے نرس کا خوفزدہ چہرہ اور ایک بوائے کی کریہہ صورت نمودار ہوئی جو اپنے گلے سے لے کر ٹانگوں تک لپٹے ہوئے سفید کپڑے میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی قبر سے نکل کر آیا ہو۔ ڈاکٹر رام ناتھ نے بستر کے قریب پہنچ کر اپنی عینک کے شیشے صاف کیئے اور اپنی مُڑی ہوئی ناک پر اچھی طرح جماتے ہوئے مریض کو گھور کر دیکھا۔ جو آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر کے زخموں سے تازہ اور گرم لہو رس رہا تھا۔ اور چہرے پر جہاں جہاں اس کی لہو بھری اُنگلیوں نے جلد کو چھُوا تھا خون کے بڑے بڑے داغ لگ گئے تھے۔ جو آہستہ آہستہ سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر رام ناتھ نے جھک کر مریض کے ہاتھوں میں بھنچا ہوا تکیہ آہستہ سے ہلایا اور اس نے اپنی

آنکھیں کھول کر بجھی بجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تم کون ہو؟" اس نے مدھم سی آواز میں رام ناتھ سے پوچھا۔
"میں اس ہسپتال کا انچارج ہوں"۔ ڈاکٹر نے نرم اور میٹھی آواز سے جواب دیا۔ "نوجوان کیا ہوا۔ تم نے اپنے زخموں سے پٹی کیوں اتار ڈالی؟"
"اس کی ضرورت نہ تھی"۔ مریض نے اس کی طرف اداس نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔
"کیوں؟" ڈاکٹر رام ناتھ نے تعجب سے کہا۔
"اس لئے کہ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا"۔ مریض نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اچانک جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو اس نے تیزی سے کہا۔
"ڈاکٹر تم کہیں سے تھوڑی سی روشنی لا سکتے ہو؟"
"روشنی؟" ڈاکٹر رام ناتھ کی نگاہیں کمرے میں پھیلی ہوئی بجلی کی روشنی میں گھوم کر رہ گئیں۔
"روشنی ڈاکٹر! مریض نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ "میرے روگ کا علاج دوائیں اور پٹیاں نہیں۔ کہیں سے تھوڑی سی روشنی لا دو۔ پھر میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا رہا ہے۔ میری آنکھوں میں دماغ میں، دل کی گہرائیوں میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ مجھے اس اندھیرے سے نجات دلاؤ کہیں سے تھوڑی سی روشنی لے آؤ۔ ورنہ —— ورنہ چلے جاؤ۔ کمرے سے نکل جاؤ —— مجھے چھوڑ دو —— میں مرنا چاہتا ہوں!"
یہ کہہ کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور تکئے کو اپنے پہلو میں بھینچ

لیا۔ ڈاکٹر رام ناتھ ایک لمحے کے لئے اپنی عینک سنبھالے حیران کھڑا رہا۔ مریض کی باتوں سے وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک خالی کمرے میں کھڑا ہے۔ اس کے آس پاس گہرا سکوت طاری ہے اور چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی اس کا دم گھونٹ رہی ہے۔ اس احساس نے اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا کر دی اور جب وہ گھبرا کر چونکا تو اس نے دیکھا کہ مریض اسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹا ہے اور اس کے پیچھے نرس اور وارڈ بوائے سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنی عینک کے شیشے صاف کئے اور نرس سے کہا ——— "جلدی جاؤ نمبر بیس سے ڈاکٹر جاوید کو بلالاؤ۔ مریض کی حالت خراب ہو رہی ہے"۔

نرس تیزی سے مڑی اور دروازے سے نکل کر ایک طرف گھوم گئی۔ ڈاکٹر جاوید جسے رام ناتھ نے ابھی بلایا تھا اس ہسپتال کا ایک نوجوان ڈاکٹر تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر ہر وقت ایک حسین مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی۔ جیسے اس دُکھ سے لبریز سیاہ خانے میں مسرّت کا فرحت بخش احساس پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تین چار سال پہلے وہ ایک سرکاری ملازمت کا امتحان پاس کرنے کے لئے سمندر پار گیا تھا۔ مگر کسی وجہ سے وہ سرکاری افسر بننے کی بجائے ڈاکٹر بن کر لوٹ آیا اور اب ایک سال سے اسی ہسپتال میں کام کر رہا تھا۔ یوں تو وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سبھی قسم کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتا تھا مگر ایسے مریض خاص طور پر اس کی نگرانی میں دیئے جاتے تھے جن کا علاج دوسرے ڈاکٹروں کے بس کا نہ تھا وہ خود بھی ایسے مریضوں کا علاج بڑی توجہ سے کیا

کرتا تھا اور ان میں اتنی دلچسپی لیتا تھا کہ اُسے اپنے سارے کام بھول جاتے تھے۔ اکثر دیکھا گیا تھا کہ وُہ رات کے وقت کسی مریض کے کمرے میں گیا اور پھر اس نے گھر جانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور وہیں میز پر سر جھکا کر سو رہا۔ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر رام ناتھ کو بھی اس پر بڑا بھروسہ تھا اور ہر ایسے موقع پر جب مریض کا علاج اس کی سمجھ سے باہر ہو وہ فوراً ڈاکٹر جاوید کو بلا بھیجتا چُنانچہ اس وقت بھی جب اس نے مریض کو اس حالت میں دیکھا تو فوراً اسے بُلا بھیجا۔ جاوید نمبر ۲۰ میں بیٹھا اپنے ایک دوست کو خط لکھ رہا تھا۔ مریض جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے باتیں کر رہا تھا۔ سو چکا تھا اور بجلی کی تیز روشنی اس کے نحیف ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کو نمایاں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا مگر ڈاکٹر کی اُمید افزا باتوں سے جیسے اسے بہت تسکین مل گئی تھی اور اس کے غمزدہ دل سے ایک بیمار مسکراہٹ رینگ کر اس کے ہونٹوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور اب وُہ چین سے سو رہا تھا۔ جاوید اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر جھکا ہوا خط لکھنے میں مشغول تھا کہ اچانک اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھُلنے کی آواز سُنی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا تو ایک نرس دبے پاؤں اس کی طرف آ رہی تھی۔

"نمبر دس کی حالت بہت خراب ہے۔" اس نے سرگوشی میں جاوید سے کہا۔ "ڈاکٹر رام ناتھ نے آپ کو بُلایا ہے"!

جاوید نے ایک لمحہ کے لئے مریض کو دیکھا جو اپنی بیماری اور دُکھ سے بے نیاز آرام سے سو رہا تھا۔ اور میز سے ناتمام خط اُٹھا کر چُپ چاپ نرس

کے ساتھ ہو لیا۔ جب وہ مریضوں کے کمروں کے درمیان سے گزرے تو وہاں خاموشی طاری تھی۔ جو مریض سو چکے تھے ان کے کمروں کی بتیاں مدھم کر دی گئی تھیں۔ جو اپنے ارد گرد زرد اور بیمار روشنی پھیلا رہی تھیں۔ کسی کسی کمرے میں نرسیں مریضوں پر جھکی ہوئی انہیں دوا پلا رہی تھیں یا ان کے نحیف اعضا پر آہستہ آہستہ مالش کر رہی تھیں اور کہیں کہیں دھیمی سسکیاں اور بڑبڑانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے چپ چاپ گزر گئے جب وہ نمبر ۱ کے دروازے پر پہنچے تو ایک لمحے کیلئے رکے اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر رام ناتھ جاوید کے انتظار میں کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا اور لوائے میز کے قریب کھڑا فکرمند نظروں سے مریض کی طرف دیکھ رہا تھا جو اسی طرح آنکھیں بند کئے اور پہلو میں تکیہ بھینچے لیٹا ہوا تھا۔ جاوید کو دیکھتے ہی رام ناتھ کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنی عینک کے شیشے صاف کئے اور انہیں اپنی ناک پر جماتے ہوئے بولا —— "ڈاکٹر جاوید! اس مریض کو دیکھو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا کہتا ہے۔" جاوید کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ وہ مریض کی طرف بڑھا مگر اچانک اس کے سر کی طرف دیکھ کر رک گیا۔

"مگر ابھی تک اسے پٹی کیوں نہیں باندھی گئی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ ڈاکٹر رام ناتھ نے اس کے قریب آ کر کہا: "یہی تو مصیبت ہے وہ پٹی باندھنے کے لئے تیار ہی نہیں۔"

"کیا؟" جاوید کی مسکراہٹ ایکا ایکی غائب ہو گئی "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں

کہ وہ پاگل ہے؟" ڈاکٹر رام ناتھ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ایک مدھم سی ہاں نکلی اور وہ خاموش ہو گیا۔

جاوید مریض کے قریب پہنچا اور بستر پر بیٹھ کر اس نے اس کے ہاتھوں میں بھنچا ہوا تکیہ آہستہ سے ہلایا اور کہا "سنو۔" مریض نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بجلی کی تیز روشنی نے اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں ایک ہلکی سی مصنوعی چمک پیدا کر دی اور اس کے چہرے پر خون کے داغوں کو اور بھی نمایاں کر دیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے نحیف آواز میں جاوید سے پوچھا۔

"میں اس ہسپتال کا ایک ڈاکٹر ہوں"۔ جاوید نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے زخموں کیلئے بڑی اچھی دوا لایا ہوں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے"۔

"میں اچھا ہو جاؤں گا؟" مریض نے بڑبڑا کر کہا ۔۔۔ "مگر مجھے کیا ہوا ہے؟"

"تمہارے سر میں زخم آئے ہیں"۔ جاوید نے نرمی سے جواب دیا۔

"میرے سر میں زخم آئے ہیں"۔ مریض نے بڑبڑا کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اپنی انگلیاں جو لہو سے لتھڑ گئی تھیں آنکھوں کے سامنے کیں۔ کچھ دیر تک وہ انہیں بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے آہ بھر کر کہا۔ "افسوس خون بھی سیاہ ہو چکا ہے۔ اندھیرے کی طرح سیاہ ۔۔۔" پھر اس نے جاوید کی طرف دیکھ کر بے چینی سے کہا۔ "اب اندھیرا میرے خون میں بھی سما گیا ہے ڈاکٹر۔ میں بیمار نہیں، میرے سر میں کوئی زخم نہیں۔ میں صرف اندھیرے میں گھِرا

ہوُا ہوُں۔ اندھیرا میرے چاروں طرف چھا رہا ہے۔ مجھے اِس سے نجات دلاؤ کہیں سے تھوڑی سی روشنی لا دو۔ تھوڑی سی روشنی — روشنی۔ روشنی۔"

اور اچانک اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جاوید کا کوٹ پکڑ لیا۔ اور مظلومی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جاوید اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یکایک ایک دھندلا سا غبار چھا گیا۔ جس میں اس کے خیالات اندھوں کی طرح راستہ ٹٹول رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اِسے کچھ بولنے کی شدید ضرورت تھی مگر اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس نے کئی بار اپنے ذہن میں پھیلے ہوئے غبار کو چیرنا چاہا مگر وہ گاڑھا ہی ہوتا چلا گیا اور اس کے خیالات اس میں کلبلاتے رہ گئے۔ اچانک اُسے ڈاکٹر رام ناتھ کی آواز کہیں دُور سے آتی سُنائی دی۔

"کیوں جاوید! اس کیس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" اور اس نے محسوس کیا کہ وُہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کے ذہنی غبار کا ایک کونہ پھٹ گیا ہے اور اس میں سے چند باتیں تیزی سے دَوڑ کر اس کی زبان تک پہنچ گئی ہیں۔

"میں اِسے سنبھال لُونگا"۔ اس نے اپنے آپ کو کہتے سُنا۔ "آپ جائیے۔ میں اس کمرے میں تخلیہ چاہتا ہوں — نرس تم نئی پٹیاں لے آؤ۔"

اور پھر اسے ڈاکٹر رام ناتھ، بوائے اور نرس کے قدموں کی چاپ مدھم ہوتی ہوُئی سُنائی دی اور کمرے میں گہرا سکوُت طاری ہو گیا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح خاموش بیٹھا مریض کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ جب اس کے ذہن میں کسی قدر اُجالا ہوُا تو وہ اِس کی طرف جُھکا اور بڑی نرمی سے اس نے پُوچھا

"میں ابھی تک تمہاری بات نہیں سمجھا۔ تمہیں جو کچھ چاہیئے وہ میں لا دونگا۔ مگر تم اپنے زخموں سے پٹیاں کیوں اتار پھینکتے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تمہارے زخم کتنے خطرناک ہیں؟" مریض کے زرد ہونٹوں پر ایک اداس تبسم پھیل گیا اور اس نے اپنی کمزور آواز میں کہا۔ "میرے زخم خطرناک ہیں مگر جو کچھ میرے اردگرد پھیلا ہوا ہے وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ میں ایک ڈراونے اندھیرے میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے ہر چیز اندھیرے میں چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں۔ کیا یہ روگ میرے زخموں سے زیادہ خطرناک نہیں۔ جواب دو۔ کیا اندھیرے میں ڈوبنا روشنی میں مرنے سے زیادہ مشکل نہیں؟ —"

جاوید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور نرس نئی پٹیاں لے کر اندر داخل ہوئی۔ جاوید نے اس سے پٹیاں لے لیں اور مریض سے کہا "سنو! میں رات بھر یہیں رہونگا۔ میں تمہاری باتیں غور سے سننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ مگر جب تک تم اپنے سر پر پٹیاں نہ باندھ لو میرے لئے کچھ سمجھنا اور غور کرنا مشکل ہے۔ میری توجہ تمہارے زخموں کی طرف لگی رہیگی۔ نوجوان شاید تم نہیں جانتے کہ لہو کی کیا قیمت ہے؟"

مریض نے پٹیوں کی طرف اداسی سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ جاوید نے اس کے سرہانے جھک کر زخم صاف کیئے اور ان پر پٹیاں باندھنے لگا۔ جب وہ اس عمل میں مصروف تھا تو اس نے مریض کی مدھم بڑبڑاہٹ سنی جو کہہ رہا تھا۔ "میں لہو کی قیمت جانتا ہوں۔ مگر اندھیرے نے لہو کو بھی سیاہ کر دیا ہے اب

لہو بھی تاریک ہو چکا ہے۔ آہ اندھیرا اپنا وار کر چکا اب کچھ کرنا فضول ہے۔ بالکل بے فائدہ ہے۔"

جب جاوید فارغ ہوا تو اس نے نرس کو رخصت کر دیا اور پھر مریض کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا گرم اور جلتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا ——"اب مجھے سمجھاؤ تمہارے ارد گرد کیسا اندھیرا چھا رہا ہے۔" مریض نے اس کی طرف اپنی سیاہ آنکھیں اٹھائیں۔ اب ان میں ہلکی سی مگر حقیقی جھلک پیدا ہو چلی تھی جاوید کو اس کے ہونٹوں پہ ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہوتا ہوا معلوم ہوا اور وہ ہلے۔ پھر ایک تیز اور صاف آواز سے اپنے بہت قریب سے آتی ہوئی معلوم ہوئی ——"یہ اندھیرا بہت عجیب ہے ڈاکٹر مجھے ہر چیز اسی طرح نظر آتی ہے جس طرح تم دیکھتے ہو۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر چیز کے گرد ایک ڈراونا اندھیرا چھا رہا ہے۔ اندھیرا جس نے ہر چیز کی چاپ چھین لی ہے۔ ہر چیز کا حسن برباد کر دیا ہے جس نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔"

"مگر یہ اندھیرا تم کب سے دیکھ رہے ہو۔" جاوید نے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا اور اس پہ ایک نامعلوم وحشت چھانے لگی۔

"بہت تھوڑے دنوں سے۔" مریض نے بیتابی سے کہا۔ "میں نہیں جانتا یہ احساس کیوں پیدا ہوا مگر جو کچھ ہوا وہ اچانک ہو گیا میں اس لمحے کو کبھی نہیں بھول سکتا جب سب سے پہلے اندھیرے نے مجھ پر اپنا کاری وار کیا۔ میں اپنی کھڑکی میں کھڑا سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ لوگ سر جھکائے

خاموشی سے گزر رہے تھے۔ شام کی اُداس فضا میں وہ خزاں کے پتوں کی طرح رینگتے چلے جا رہے تھے۔ چپ چاپ ـــــ جیسے انہیں خاموشی سے عشق ہو گیا ہو۔ یکایک سڑک کے ایک موڑ سے چند سپاہی بے شمار مزدوروں کو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے گزرے۔ مزدور منہ لٹکائے ایک لمبی قطار کی صورت میں گزر رہے تھے اور ان کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی لوہے کی ہتھکڑیاں جھنجھنا رہی تھیں۔ وہ سامنے سے گزرنے لگے۔ سڑک پر چلتے ہوئے بے شمار لوگوں کے درمیان ان کے بھاری بھاری قدم بڑھتے چلے گئے۔ مگر کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اس طرح چل رہے تھے جیسے اکیلے ہی سڑک پر سے گزر رہے ہیں۔ ان کے آس پاس کچھ نہیں۔ خود ان کا سایہ بھی نہیں۔ میرے ذہن میں ایک مدھم سی دھند پھیلنے لگی اور اس میں ایک ہجوم کا منظر ابھر آیا۔ جس کے درمیان بالکل انہی مزدوروں کی طرح ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا ایک آدمی گزر رہا تھا۔ ہجوم اس کے گرد کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔ مگر خالی نعرے! اور قیدی چلا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصہ کی وجہ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے دانت پیس رہا تھا۔ مجھے اس کے دانتوں کی کٹکٹاہٹ سُنائی دینے لگی۔ میرے دماغ میں ایک شور سا برپا ہوا! چند چیخیں گونجیں اور پھر زمین سے لوہے کی سینکڑوں سلاخیں نمودار ہو گئیں جن کے پیچھے سے لاتعداد پژمردہ چہرے میری طرف جھانکتے ہوئے اپنے ہاتھ ہلانے لگے۔ ان کے ہلنے سے لوہا بجنے کی خوفناک جھنکار پیدا ہوئی اور پھر اچانک ان کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ قیدی مزدوروں کے گرد بھی تاریکی

بل کھانے لگی۔ سڑک پر گزرتے ہوئے راہگیروں کے گرد بھی اندھیرے کے پردے پھیلنے لگے اور پھر ہر چیز تاریکی میں گھر گئی۔ ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ گئیں اور میں خوفزدہ ہو کر اس سیاہ خانے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جہاں روشنی کی کوئی کرن اور اُجالے کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔"

ڈاکٹر جاوید کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن سی چمکی۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مریض کے مرض کو جان لیا ہے وہ اس کی بیماری کو پا گیا ہے اور خود مریض اب اس کے لئے کوئی معمہ نہیں رہا بلکہ اس نے اسے بخوبی شناخت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کے گہرے دُکھ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے غم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر؟" مریض نے اسی بیچینی سے کہا۔ "پھر سب کچھ ہو گیا ـــــ میری نگاہیں بھی کہیں اندھیرے میں کھو گئیں۔ میرے کمرے کی ساری چیزیں تک بھیانک ہو گئیں۔ خاص طور پر اس دیس کا وہ نقشہ جسے میں نے خود بڑے شوق سے بنایا تھا۔ اندھیرے کے خوفناک حلقے میں گھر گیا اور اس پر پھیلے ہوئے دھوئیں میں سسکیاں اور آہیں سنائی دینے لگیں۔ میں گھبرا کر باہر بھاگا۔ مگر وہاں بھی اندھیرا تھا۔ بجلی کے سیاہ بلب سڑکوں پر تاریکی پھیلا رہے تھے۔ آسمان سے چاند کی کالی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور زمین پر تاریکی کے ٹھوس مجسمے چپ چاپ چل رہے تھے۔"

جاوید کا غم اب بڑھتا جا رہا تھا۔ مریض کی دُکھ بھری آواز سن کر اس کا جسم سُن ہو رہا تھا جیسے اس کے ہر عضو کی حرکت رُک گئی ہو۔ مرگئی ہو۔ فقط اس کا دل زندہ تھا۔ اور ایک آتشیں احساس سے جل رہا تھا۔

"پھر؟" اس نے مریض سے پوچھا اور آنسوؤں کے قطرے ضبط کے باوجود اس کی پلکوں پر اُتر آئے۔

"پھر اندھیرا بڑھتا چلا گیا" مریض نے جیسے اپنے دانت بھینچ کر کہا۔ "اندھیرا ہر چیز میں سماتا چلا گیا۔ اندھیرا میرا دم گھونٹنے کے لئے پھیلتا چلا گیا اور تاریک فضا میں تاریکی کے ٹھوس مجسمے مارچ کرتے ہوئے میری طرف بڑھتے رہے۔ ان کے قدموں کی یکساں آواز میرے کانوں میں پہنچ کر میرا خون خشک کرتی رہی۔ مگر میں زندہ رہا۔ میں روشنی کی اُمید میں زندہ رہا۔ مجھے یقین تھا کہ روشنی آئے گی اور مجھے اس زندان سے رہائی ملے گی۔ میرے چاروں طرف ایک سہانا نور پھیل جائے گا۔ تاریکی کے مجسمے پگھل جائیں گے اور میں پھر ہر چیز کا حُسن ایک بار دیکھ سکوں گا۔ اُسے چھو سکوں گا۔ محسوس کر سکوں گا۔ میں اسی امید پر زندہ تھا۔ مگر آج شام اندھیرے نے مجھ پر اپنا کاری وار کر دیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ چند سپاہی سر جھکائے ہوئے مزدوروں کی قطار ساتھ لے کر سیدھے دروازے میں گھس آئے۔ سڑکوں پر چپ چاپ چلنے والے راہگیر میرے ارد گرد ناچنے لگے۔ تاریک فضا میں تاریکی کے ٹھوس مجسمے مارچ کرتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میں گھبرا کر بھاگا۔ روشنی —— روشنی —— میں نے چیخ کر کہا۔ مگر روشنی تو ہمیشہ کے لئے کھو گئی تھی۔ مجھے روشنی نہ ملی اور

پھر تاریکی میں بھاگتے ہوئے سیڑھیوں پر میرا پاؤں پھسل گیا — اندھیرا غرا کر میری طرف جھپٹا۔ سر جھکا کر گزرتے ہوئے مزدوروں کی ہتھکڑیاں جھنجھنائیں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سے آہنی زنجیروں کی خوفناک جھنکار پیدا ہوئی اور تاریکی کے ٹھوس مجسمے مارچ کرتے ہوئے میرے اوپر سے گزرنے لگے۔ ایک ساتھ اٹھتے ہوئے قدموں کی بھیانک آواز ہتھکڑیوں کی جھنجھناہٹ اور آہنی زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ میرے دماغ کو روندنے لگی۔ اور میرے ہوش جواب دے گئے۔"

ڈاکٹر جاوید کا دل شدتِ غم سے بیٹھنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے مریض پر جھک کر کہا — "چاروں طرف اندھیرا چھا رہا ہے۔"

مریض کی آنکھوں میں جواب انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں ایک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اور اس نے کہا "مگر میں اب اندھیرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے کہیں سے تھوڑی سی روشنی لا دو۔ روشنی — روشنی —"

"میں تمہیں روشنی لا دوں گا۔" جاوید نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھال کر بڑی مشکل سے کہا — "مگر اب تو بہت رات ہو چکی ہے صبح ہو لینے دو۔ بس اب تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے۔ اتنی دیر تم ذرا سو لو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

مریض نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر لیں۔ جاوید کو تھوڑی ہی دیر گزرنے پر یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ سو گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر اسے

چھپکے سے کپڑا اڑھا دیا۔ اور میز پر بیٹھ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی باتیں زہریلے نشتر بن کر اس کے دل میں اُتر گئی تھیں اور انہوں نے ایک ایسے راز کو بے نقاب کر دیا تھا جسے وہ ایک عرصہ سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا آج سے چار سال پہلے جب وہ سرکاری ملازمت کا امتحان دینے سمندر پار گیا تھا تو ایک نامعلوم خلش نے اسے بےچین کر دیا تھا۔ ایک ایسی زہریلی حقیقت اس کے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی کہ اس کے لیئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی دُکھ سے بچنے کے لیئے اس نے ڈاکٹری کے پیشے میں پناہ لی تھی۔ مگر وہی خلش، وہی زہریلی حقیقت اس مریض کی صورت میں اس کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں بھی آ پہنچی تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ کہاں جائے ——— اُسے اپنا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ پلکیں بوجھل ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں اور اُس کا سر میز پر جھکنے لگا۔

اسے معلوم نہیں وہ کب تک سوتا رہا۔ مگر اس کے کانوں میں ہتھکڑیوں کی جھنجھناہٹ گونجتی رہی اور لوہے کی سینکڑوں سلاخوں کے پیچھے لاتعداد پژمردہ چہرے اپنے ہاتھ ہلاتے رہے اور اِن سے آہنی زنجیروں کی خوفناک جھنکار سُنائی دیتی رہی۔ پھر تاریکی کے ٹھوس مجسموں کی قدموں کی یکساں آواز اس کے دماغ کو روندنے لگی۔ اور یکایک مریض کا زرد چہرہ اس کے سامنے اُبھر آیا۔

"روشنی لاؤ ڈاکٹر" وہ غصہ سے جھنجھلا کر کہہ رہا تھا۔ "روشنی لاؤ تم نے

وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے روشنی لا دو گے۔ مگر میں جانتا ہُوں کہ تم جھوٹے ہو تم مجھے تسلی دے رہے ہو۔ تم روشنی نہیں لا سکتے۔ اور —— اور اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اندھیرا میرا دم گھونٹ رہا ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا مجھے چھوڑ دو —— میں مرنا چاہتا ہُوں۔ اور پھر بہت سی ہتھکڑیاں ایک ساتھ جھنجھنائیں اور وُہ ایک تیز چیخ سُن کر چونک پڑا۔ "ڈاکٹر ——" کانپتی ہوئی نرس اس کے قریب ہی کھڑی چلّا کر کہہ رہی تھی

"وہ —— وہ ——"

اور وُہ اس کے آگے کچھ نہ سُن سکا۔ اس نے خواب آلُود نگاہوں سے دیکھا کہ مریض اپنے بستر پر مرا پڑا ہے۔ اس کے زخموں سے لہُو نکل نکل کر چہرے پر جم گیا ہے اور سیاہی مائل خُون آلُود پٹیاں نچی ہوئی فرش پر بکھری پڑی ہیں۔ اچانک جاوید کو اپنے اِرد گِرد ایک خوفناک اندھیرا پھیلتا ہوُا محسوس ہوُا۔ اور اُس نے گرنے سے پہلے سہارے کے لئے ہوا میں ہاتھ پھیلا دیئے ——!

تنہائی

ہسپتال سے نکل کر جب وہ سڑک پر پہنچی تو یکا یک بجلی کی بتیاں روشن ہو گئیں اور ہر طرف ایک سہانی جوت پھیل گئی جس کے نظارے سے اس کے دِل کی اُداسی کم ہونے لگی۔

رات کی رانی کی دِلنواز مہک نے خُنک ہوا میں پھیل کر شام کو اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی جیسے سُنسان راہوں نے اُجلی اُجلی روشنی سے اپنا رُوپ سنوار لیا تھا اور سڑک پر بے شمار لوگ ٹہلتے ہوئے اُس باغ کی طرف جا رہے تھے جس کے بعض درختوں کی ٹہنیاں ہسپتال کی دیواروں سے لپٹ کر اندر کو جھک آئی تھیں۔ برآمدے میں لیٹے ہوئے مریضوں کی نگاہیں ان رنگا رنگ پھولوں کو بڑی حسرت سے تاکا کرتی تھیں جن کی فراوانی

نے دیواروں کو گُل پوش بنا دیا تھا۔ ابھی ابھی وہ اسی برآمدے سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے آئی تھی اور ایک میل دُور اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی جس کی ویرانی سے اسے سخت نفرت تھی مگر اس کے باوجود وہ وہاں رہنے پر مجبور تھی۔ چھ گھنٹے تک بیماروں کی سسکیاں اور بددُعائیں سُن سُن کر اس کے دِل پر شدید اُداسی طاری ہوگئی تھی اور اس وقت جبکہ وہ بھاری بھاری قدموں کے ساتھ ہسپتال کے دروازے سے نِکل رہی تھی تو اس کے کندھوں پر ایک ایسا غیر مرئی بوجھ لدا ہوا تھا جس سے اِس کے اعضا نڈھال ہو رہے تھے۔ اپنے فلیٹ کو جانے والے راستے پر مڑنے سے پہلے اِس کی نگاہ اچانک ہسپتال کے برآمدے کی طرف چلی گئی اور اس نے دیکھا کہ سفید بستروں کی قطار پر چند سیاہ جسم بےحِس و حرکت پڑے ہیں اور بجلی کی دھیمی اور اُداس روشنی میں ایک بھیانک سایہ اُن پر جھکا ہُوا کانپ رہا ہے۔ اُس کے دِل میں ٹیس سی اُٹھی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ سڑک پر ہولی۔ اس ہسپتال میں وُہ چھ مہینے سے کام کر رہی تھی اور سینکڑوں مریضوں کی دیکھ بھال کر چکی تھی مگر اس پہنچنے کے آغاز ہی سے اس کے دل میں ایک خاص بات کی کھٹک پیدا ہوگئی تھی اور یہ راز اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمام مریضوں کے روگ کی نوعیت ایک ہی قسم کی کیوں ہوتی ہے۔ خیال بس کی گانٹھ بن کر اس کے ذہن میں سما گیا تھا اور بخار سے جلتے ہوئے سیاہ جسم خون اور پیپ سے سڑے ہوئے اعضا اور بھیانک آنکھوں کی بجھتی ہوئی جوت دیکھ کر بھی اسے یہی معلوم ہوتا تھا جیسے یہ روگ اس امٹ دُکھ کے عجیب سے چھوٹے نشان ہیں جو دِل کی گہرائیوں میں خاموشی سے آگ جلاتا

اور اس کے شعلوں کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ جب وہ رات کے سناٹے میں چار پائیوں پر خاموشی سے لیٹے ہوئے مریضوں کو دیکھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سب کے سب دل کی چتا میں جل رہے ہیں اور زہریلے دھوئیں کے بادل اُن کی اُداس آنکھوں کو آنسوؤں سے چھلکا رہے ہیں۔ یہی مریض اپنے زخموں کی چیر پھاڑ اور بیماری کے شدید حملوں کو چپ چاپ برداشت کر لیتے تھے مگر کبھی ان جانے دُکھ کا اُبھار ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیتا تھا اور وہ بے بس ہو کر رونے لگتے تھے۔ اگر کسی ان دیکھے دریچے سے وہ ان کے دِلوں میں جھانک سکتی تو وہ ضرور اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتی جس کا زہریلا دھواں آنکھیں آنسوؤں میں ڈھل رہا تھا۔ مگر وہ بے بس تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کئی دفعہ برآمدے میں کھڑے پھولوں بھری دیواریں دیکھ کر وہ خود کسی نامعلوم دُکھ کی شدّت سے مغلوب ہو کر رونے لگی تھی اور دیر تک اس کے آنسو بہتے رہے تھے۔ برآمدے کے مریض دُوسرے کمروں کے مریضوں کی بہ نسبت زیادہ آنسو بہاتے تھے اور شاید اس کی وجہ وہ پھول تھے جو سامنے والی دیوار پر کھلے ہُوئے تھے۔ مریض اور پھول ـــ اور وہ خود بھی تو پھولوں کو دیکھ کر رو دیتی تھی مگر اسے کیا مرض تھا؟ بلکہ پھول تو اسے بے حد مرغوب تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا دِل ایک عجیب کیفیت سے لبریز ہو جاتا تھا خصوصاً نیلے پھول تو جیسے اس کی رُوح کے کسی بے حد نازک گوشے کو گدگداتے تھے اور اس کا جسم ایک میٹھا اور پُرلذّت درد محسوس کرنے لگتا اور لال پھولوں پر تو وہ جان دیتی تھی۔ سیاہی مائل لال لال پھول جیسے اس کے اپنے خون سے رنگے

ہوئے مُجھے کیونکہ انہیں دیکھتے ہی اس کے لہو میں ایک دلکش حرارت پیدا ہو جاتی تھی اور اس کے خیالات میں یکایک اتنا تلوّن پیدا ہو جاتا تھا کہ وُہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ انہیں ٹہنیوں سے توڑ کر مسل دے یا اپنے سینے سے لگا کر ان کی سُرخی کو اپنے انگ انگ میں بسا لے۔ ان پھولوں سے وہ ایک ہی وقت میں محبت اور نفرت کرتی تھی شائد اس لئے کہ اس کے جسم کے رنگ میں بھی وہی امتزاج موجود تھا جیسا ان پھولوں کی سُرخی اور سیاہی میں۔ اگر اس کا رنگ سیاہ نہ ہوتا تو وُہ سُرخ گلاب کا ایک تازہ پھول معلوم ہوتی مگر کالی کالی جلد نے اُس کے جوان جسم اور تازہ لہو پر ایک سیاہ پردہ ڈال دیا تھا اور اب وہ تازہ پھول کی بجائے ایک باسی پھول معلوم ہوتی تھی جس کو سیاہی کی تہہ نے بھیانک بنا دیا ہو۔ جب وُہ آئینے میں اپنی صُورت دیکھتی تو اسے یُوں محسوس ہوتا جیسے جوانی کے تازہ لہو پر دھوئیں کی ایک میلی سی چادر چڑھ گئی ہے۔ اس دھندلی سی چادر نے اس کے لہو کا رُوپ چھین لیا تھا اور اس کے شاداب ہونٹوں کی نمی کو دھندلا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے گرم لہو میں ایک متوالا بنا دینے والا رس موجود ہے مگر جلد کی سیاہی نے اس رس کو اندھیرے غاروں میں چھپا لیا تھا اور وُہ لوگوں کی پُرشوق اور تمنا بھری نگاہوں سے محروم ہو گئی تھی۔ سیاہی مائل لال پھولوں کو دیکھتے وقت شائد اسی لئے اس کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں مگر وُہ محض اپنی خوبصورتی سے محرومی پر روتی تھی یا اس کے پیچھے کوئی خاص مرض تھا، کوئی اور امٹ دُکھ تھا جس کے نامعلوم درد سے اس کے سارے اعضا اینٹھ رہے تھے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی

تھی اور اس پر ایک شدید اُداسی طاری ہو جاتی تھی جسے کم کرنے کے لئے وہ اپنے گلے میں لپٹی ہوئی پیتل کی ایک پتلی سی زنجیر کو ہلانے لگتی تھی۔ یہ زنجیر اس کی ماں نے بچپن ہی سے اس کے گلے میں لٹکا دی تھی تا کہ وہ ان نادیدہ آفتوں سے بچی رہے جو انسان پر خاموشی سے جھپٹتی ہیں اور کاری وار کرتی ہیں۔ اسے اس زنجیر پر بڑا بھروسہ اور اعتقاد تھا۔ چنانچہ وہ سوتے وقت بھی اسے گلے سے نہیں اتارتی تھی مگر اب۔ کبھی کبھی جب وہ مریضوں کو کڑوی دوائیں پیتے وقت منہ بناتے دیکھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بھی خون اور سیاہی کا ایک کڑوا مکسچر ہے جسے مرد منہ سے لگاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اس لئے اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے گلے میں لٹکی ہوئی زنجیر اتار کر پھینک دے اور وہ نادیدہ آفتیں جن سے بچنے کے لئے اسے پہنا گیا تھا۔ ایکا ایکی اس پر ٹوٹ پڑیں اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیں اس کے عضو عضو کو کچلیں اور اس کی ہڈیوں کا گودا تک جھنجھوڑ دیں۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ غیظ کے عالم میں اپنے گلے کی طرف بڑھتے مگر اچانک کہیں سے اس کی ماں کا نحیف اور بے رونق چہرہ فریاد کرتا ہوا ابھر آتا اور وہ بے بس ہو کر جیسے اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتی۔ اس کی زندگی یوں بھی کچھ کم تلخ نہیں تھی مگر اس کے پیشے نے تو اسے بالکل ہی زہر بنا دیا تھا۔ دیکھنے میں وہ "فلاورز نرسنگ ہوم" کی ایک نرس تھی مگر در اصل وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ نہ ایک نرس نہ ایک عورت نہ ایک مرد۔ کچھ بھی نہیں۔ تو پھر آخر وہ تھی کیا؟ ایک غم نصیب روح جو اتنی بڑی دنیا میں بالکل اکیلی ہو اور اپنی تنہائی سے بے حد خوفزدہ اور پریشان ہو۔ اپنے بے رونق فلیٹ میں بیٹھے بیٹھے جب اس کے

دل کی ویرانی اور بھی بڑھ جاتی تو اس کا جی چاہتا کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اسی حالت میں سڑک پر کود پڑے۔

اس بھیانک خیال کے آتے ہی اس کے ذہن میں بجلی سی چمکتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے سڑک پر چھلانگ لگا دی ہے اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد اس کی جان نکل گئی ہے۔ سڑک پر ایک ننگا جسم خون میں لتھڑا ہوا پڑا ہے اور لوگوں کا ہجوم اسے رحم آمیز بھوکی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے پھر اچانک کچھ جوان ہاتھ اسے اٹھانے کے لیے جھکتے ہیں اور ـــــ اور پھر وہ گرم گرم ہاتھ۔ وہ آتشیں انگلیاں جیسے اس کے جسم میں کھبنے لگتی ہیں۔ اس کے خون میں ایک دلکش حرارت پیدا ہونے لگتی ہے اور پھر ایک سرخ آندھی چلتی ہے ایک خونیں طوفان نمودار ہوتا ہے۔ لال لال لہو جوش کھاتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور اس کے جسم کے ہر حصے پر ایک ایسا دباؤ پڑنے لگتا ہے جس سے اس کا انگ انگ میٹھی لذت کے متوالے نشے میں چور ہو جاتا ہے۔ وہ دیر تک بیٹھی اس راحت بخش لذت کے مزے میں ڈوبی رہتی اور اسی حالت میں یا تو وہ سو جاتی اور یا گلے میں لٹکی ہوئی زنجیر کو ہلانے لگتی ــــ

اس کا فلیٹ جہاں وہ اس ہسپتال میں ملازم ہوتے ہی اٹھ آئی تھی۔ ہسپتال کی بے رحم دیواروں سے بھی زیادہ سنگدل تھا۔ ایک اجڑا ہوا بے رونق گھر جسے دیکھ کر دل میں خودکشی کر لینے کی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ اس بھیانک ماحول سے گھبرا کر وہ ہسپتال کو دوڑتی تھی اور ہسپتال سے تنگ آ کر فلیٹ کو اور ان دونوں کے بیچ ایک طویل سڑک اس خوشگوار انٹرول کی طرح چمک

اُٹھتی تھی جو تماشائیوں کو ایک واہیات فلم کی نمائش کے درمیان نصیب ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اسی سڑک پر چل رہی تھی اور سڑک حسب معمول خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی جیسے اسے پھولوں والے ہسپتال میں کام کرنے والی سیاہ فام نرس مس ڈیزی سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے زیادہ نکھر آئے تھے بجلی کی بتیوں کی روشنی سڑک کی سیاہ سطح کو اُجال رہی تھی اور چند لوگ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یوں چل رہے تھے گویا اندھیری رات میں راستہ ٹٹول رہے ہوں۔ ڈیزی یہ دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئی اور اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ اس طرف آنے کی بجائے باغ میں ہی کیوں نہ چلی گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیئے رُکی بھی مگر فوراً ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک شدید غلطی کر رہی ہے۔ باغ اس بے جان گذرگاہ سے اچھا ہی سہی اور وہ کئی بار وہاں گئی بھی تھی مگر جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اس سے اسے کتنا صدمہ پہنچا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ "فلاورز نرسنگ ہوم" کی آدھی سے زیادہ نرسیں اسے وہاں کالج کے لونڈوں، فوجی گوروں اور صحت یافتہ مریضوں کے ساتھ ٹہلتی نظر آئیں گی مگر اس نے دیکھا اور حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اپنے یاروں کے ساتھ گھوم رہی ہیں آنکھیں مٹکا رہی ہیں اور شراب کے نشے میں چور گلے میں باہیں ڈال کر انہیں چوم رہی ہیں۔ اس کے لیئے یہ منظر جتنا دلخراش تھا اسے کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ پھر وہ وہاں کیوں جائے؟ نہیں وہ وہاں نہیں جائے گی۔ کبھی نہیں جائے گی چاہے یہ روشن سڑک بجلی کے کھمبوں کی طرح بے جان ہو جائے، آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اندھے ہو جائیں

اس گذرگاہ پر چلتے ہوئے آدمی پتھر کے بُت بن جائیں مگر وہ باغ میں نہیں جائیگی ہرگز نہیں جائے گی۔ وہ پھر اسی سڑک پر چلنے لگی اور اس کے ہاتھ زیادہ تیزی کے ساتھ گلے میں لپٹی ہوئی زنجیر سے کھیلنے لگے۔ اس کی اُنگلیاں جیسے پیتل کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پیوست ہو جانا چاہتی تھیں اور وہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اپنے دِل کی ہلچل سینے سے نکال کر سڑک پر پھینک دے اور خود بھاگ جائے یا اسے ایک کبوتر کی طرح ہوا میں اُڑا دے جو چُپ چاپ سناروں کی طرف اُڑ جائے مگر جب وہ اس میں ناکام رہی تو اس کے قدم اور بھی تیز ہو گئے اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر پہنچنے سے پیشتر ہی اس کے اندر ایک زور کا دھماکا ہوگا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سڑک پر بکھر جائے گی ــــ

اسی پریشانی کی حالت میں جب وہ سڑک کے اس موڑ پر پہنچی جہاں سے گھوم کر وہ اپنے فلیٹ کو جایا کرتی تھی تو ایک موٹر اس سے اتنی قریب ہو کر گذری کہ اگر وہ اُچھل کر ایک طرف نہ ہو جاتی تو شاید نیچے آ کر کچلی جاتی۔ اس کے مُنہ سے ایک غلیظ سی گالی نکلی جسے سن کر ایک ٹٹ پونجیا کوچوان جو سڑک کے کنارے تانگے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا چونک پڑا اور گھبرا کر بولا۔

"کہاں جانا ہے میم صاحب۔ چھاؤنی۔ مال روڈ۔ میٹرو کلب ــــ"

"شٹ اپ"۔ ڈیزی نے جھنّا کر کہا۔

"اوہ"۔ کوچوان نے جیسے اپنی حماقت کا احساس کرتے ہوئے کہا اور شرمندگی سے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ڈیزی نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے اپنے فراک کا کالر ٹھیک کیا اور موڑ گھوم گئی۔ جب وہ پنواڑی کی دوکان کے سامنے سے گذری تو اچانک

اسے خیال آیا کہ اس کے سگریٹ ختم ہو چکے ہیں چنانچہ وہ دوکان کی طرف مڑی اور دو پیکٹ لے کر اس نے ایک سگریٹ سُلگایا۔ دیا سلائی کا شعلہ ایک لمحے کے لیے اس کے سیاہ چہرے پر کانپا اور بجھ گیا اور وہ اپنے پیچھے دھوئیں کے چند لطیف حلقے چھوڑ کر آگے بڑھی۔ سڑک کے جس حصے پر وہ اب چل رہی تھی وہ بالکل تاریک تھی اس کے اپنے نصیب کی طرح تیرہ و تار اور اس اندھی تاریکی میں اس کا سگریٹ سُرخ ستارے کی طرح روشن تھا، اسے تاریکی میں چمکتی ہوئی سُرخی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی، شائد وہ خود بھی اسی طرح چمکنا چاہتی تھی، چنانچہ اکثر رات کے وقت وہ اپنے فلیٹ کی زرد اور بیمار بتی بجھا کر اندھیرے میں سگریٹ جلا کر اسے دیکھا کرتی تھی، اس منظر سے اسے کس قدر فرحت حاصل ہوتی تھی ایک وسیع اور بے پایاں خوشی اور اس کا سارا جسم خون کے راگ گانے لگتا تھا، میٹھی میٹھی لالی کے، جو سگریٹ کے جلتے ہوئے تمباکو کی رُوح کا جوہر تھی اس وقت وُہ سوچتی کہ کتنا اچھا ہوتا اگر وُہ عورت ہونے کی بجائے ایک سگریٹ ہوتی، خواہ اس پر "تار" کا چھاپہ ہی کیوں نہ ہوتا، پھر بھی وہ کسی مرد کے دو سُرخ ہونٹوں میں تو جلتی، دیا سلائی کا زرد شعلہ آہستگی سے اس کا منہ چومتا، اور وہ سُلگ اُٹھتی۔ اس کے چہرے پر سُرخ بہار چھا جاتی اور جب کوئی زور کا کش لگا کر دھوئیں کی تلخی سے کھانسنے لگتا۔ تو وہ سُرخ شعلے کی طرح چمک کر اپنی فتح کا اعلان کرتی، اُس اندھیرے فلیٹ میں جلتے ہوئے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے وہ اسی طرح سوچا کرتی اور جب وہ اپنی پریشان خیالی سے گھبرا جاتی تو اس بُری طرح سے سگریٹ پینے لگتی کہ کھانستے کھانستے اس کی

سانس اُلٹ جاتی۔ اس وقت سڑک پہ چلتے ہوئے بھی وہ کچھ ایسے ہی سوچ رہی تھی، بے اختیار نامکمل خیال اس کے ذہن کال کوٹھڑی میں پریشانی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، اور اسی طرح خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے جس قدر کہ وہ عورت جو ایک ویران اور تاریک سڑک پہ اکیلی چلی جا رہی تھی، تنہائی اور تاریکی، تاریکی اور تنہائی، اس کی زندگی کے یہی دونوں رُخ تھے۔ اور کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر خوف سے لرز اُٹھتی تھی کہ وہ تنہا ہے، اکیلی ہے اور چپ چاپ آنکھیں بند کیے ایک ان جانے راستے پہ چلی جا رہی ہے، جس کی منزل کا اسے کوئی پتہ نہیں، وہ کتنا چاہتی تھی کہ وہ اکیلی نہ رہے، اس کے ساتھ بھی دوسری عورتوں کی طرح کوئی ہم سفر ہو۔ کوئی انوکھا اور رسیلا مسافر، جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ بڑھتی چلی جائے، اور چلتے چلتے وہ رہ رہ کر اپنے محبوب کے چہرے کی طرف دیکھے، اس کی روشن آنکھوں میں جھانکے، اس کے بالوں کو سُلجھائے، اس کے گلے سے لپٹ جائے، اور پھر وہ میٹھے رسیلے اور طویل بوسے زندگی کے مسافروں کے خواب آور اور شرابی نغمے اس کے ہونٹوں سے اُتر کر اس کے جسم کے کونے کونے میں پھیل جائیں۔ تھرتھراتے ہوئے، ناچتے ہوئے اور نشے میں چور، وہ طویل بوسے وہ شرابی نغمے اس کی روح کے تاروں کو جھنجھنا ڈالیں۔ اور پھر اس کا انگ انگ ناچ اُٹھے۔ اس کے لہو کی ایک ایک بوند تڑپنے لگے اور اس رقص سے وہ لذت، وہ پیار اور وہ عشق جنم لے، جو اس کی آنکھوں میں زندگی بھر ٹھنڈک بن کر زندہ رہے، مگر وہ جانتی تھی کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وہ ازل سے سمجھی ہے، اور ابد تک اکیلی رہے گی، اس کی سیاہ جلد میں چھپا ہوا کمزور اور

بدصورت جسم اس کی آرزوؤں کی راہ میں ایک امٹ اور اٹل رکاوٹ تھا اور جس طرح اس کے سامنے پھیلی ہوئی سڑک کو اپنی تاریکی دور کرنے کے لئے دن کے اُجالے اور بجلی کی بتیوں کی ضرورت تھی، اسی طرح اسے بھی زندگی کے اندھیرے راستے میں کسی روشنی کی تلاش تھی، کسی سہارے کی، جو اس کی طرف بڑھے اس کا ہاتھ پکڑ لے، اور اسے اپنے بازوؤں میں کھینچ کر کہے، "جانِ بہار میں کچھ دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، تم کہاں تھیں، اور اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو" ——

اور پھر —— پھر ——

مگر وہ ان باتوں کو ترس رہی تھی اس محبت کی شدید پیاس سے اس کی روح کی زبان باہر لٹک آئی تھی، وہ چاہتی تھی کہ یکایک، اچانک سڑک پر چلتے چلتے دفعتہً ایسا حادثہ ہو جائے اور اندھیرے میں چھپے ہوئے کسی پُراسرار مقام سے اس کا اَن دیکھا محبوب چپکے سے نکل کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لے، مگر سڑک خاموش تھی اور تاریکی اس کے سینے پر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ ڈینزی کو یوں معلوم ہوا جیسے وہ اندر ہی اندر پگھل رہی ہے اور اگر وہ جلدی ہی گھر نہ پہنچ گئی تو شائد وہ اسی سڑک کی سیاہی میں گھُل جائے گی اور صبح کسی کو یہ بھی نہ چل سکے گا کہ "فلاور نرسنگ ہوم" کی ایک نرس مس ڈینزی کہاں گم ہو گئی چنانچہ اس نے گھبرا کر تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دیئے اور اس کا ایک ہاتھ بےچینی سے گلے میں لٹکی ہوئی زنجیر کو ہلانے لگا، جب وہ اپنے فلیٹ سے تھوڑی دور رہ گئی۔ تو اس کے سامنے سڑک کی پیلی طرف اندھیرے میں یکایک دیا سلائی کا شعلہ کانپ اُٹھا۔ اور اس کی زرد روشنی میں اس نے دیکھا کہ کیا ہے"

(جس کی عمر اسے کوئی پچیس تیس سال کے درمیان معلوم ہوئی) بجلی کے کھمبے سے کچھ دُور کھڑا سگریٹ سلگا رہا ہے اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی اور پھر کسی خیال سے شرما کر دوبارہ قدم اُٹھانے لگی، جب وُہ اپنی پیتل کی زنجیر کو بھینچی سے ہلاتے ہُوئے بجلی کی بتی کے عین نیچے سے گزر رہی تھی تو پرلی طرف سے وہی نوجوان جلتے ہُوئے سگریٹ کو مُنہ میں دبائے اندھیرے کے پردے کو چیر کر باہر نکل آیا، ایک لمحے کے لئے ڈیزی اور اس کی نگاہیں ملیں، اور ایک دُوسرے پر جم کر رہ گئیں۔ ڈیزی کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور اس کا جی چاہا کہ وہ مرد جو سامنے کھڑا اسے گھُور رہا ہے۔ جھپٹ کر اسے اپنی آغوش میں لے لے اور وہ اِس کی گرفت سے بچنے کے لئے جدوجہد کرے۔ اس کے بازؤں میں تڑپے کلبلائے، چیخے اور چلا چلا کر کہے مجھے چھوڑ دو۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ مگر اس کے بازو اس کے گرد مضبوط ہوتے چلے جائیں۔ اس کا سینہ اس کی چھاتی میں جذب ہوتا چلا جائے اور وہ تھوڑی ہی دیر میں ساری کی ساری اس میں تحلیل ہو جائے اور اس کی جوانی اُس کے ماتھے پر پسینے کی ایک بُوند کی طرح چمکنے لگے۔ اس احساس سے اسے بڑی لذت حاصل ہوئی اور اس نے شرما کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ جو بیوقوفوں کی طرح اس کے گلے میں لٹکی ہُوئی زنجیر کو گھُورتا ہی جا رہا تھا۔ ڈیزی کے قدم ایکا ایکی منوں بھاری ہو گئے اس نے خیال کیا کہ شاید وہ اِس کی چھاتیوں کی طرف گھُور رہا ہے اور اس نے اپنی ساڑھی کے پلُو سے اپنا سینہ ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی، نوجوان کو اچانک جیسے ہوش سا آگیا اور وہ مُسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔

"تم اب تک کہاں تھے؟" ڈیزی کی آنکھوں نے اس سے سوال کیا۔
"بس یں یہیں تھا، بھئی معاف کر دو، بس یونہی ذرا دیر ہو گئی" نوجوان نے خاموشی سے جواب دیا، اور اب وہ اس کے بالکل قریب آگیا، ڈیزی کا دِل ناچ اُٹھا۔ "تم آگئے"!

اس نے دل ہی دِل میں کہا "میں تو ازل سے ہی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میری رُوح ہر وقت تمہارے قدموں کی چاپ محسوس کرتی تھی۔ ایک ایسی نرم اور گداز چاپ جس میں تمہاری آمد کا پیام تھا۔ اور تمہیں نہیں معلوم میں تمہارے کسی وقت بھی آجانے کے خیال سے کس طرح ہر وقت سنگھار نکھار کئے رہتی تھی، وہ میرے رنگا رنگ کے ریشمی بلاؤز، وہ میری مہین و زریں ساڑھیاں، وہ میرے خوشبو میں گندھے ہوئے بال، وہ پھولوں کے گجرے، وہ عطر میں بسی ہوئی سیج ——— لیکن اس وقت تو تم نہیں آئے، اور اب، اب تم اچانک آگئے ہو، بھلا بتاؤ تو اس سڑک پر میں کیا کر سکتی ہوں۔ ہاں اگر تم میرے فلیٹ پر چلو تو ———"

اچانک نوجوان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ شرما کر سمٹنے کی کوشش کرنے لگی)
"بھئی واہ" نوجوان نے بے پروائی سے ہنس کر کہا۔ "تم تو ڈرتی ہو"۔
"نہیں تو" ڈیزی نے مُسرت کے باوجود سہم کر کہا۔
"تو پھر آؤ ذرا گھومیں" اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔
"ہاں ——— لیکن گھر کیوں نہ چلیں ——— میرا فلیٹ خالی ہے" ڈیزی

اب دلیر ہوتی جا رہی تھی۔
"چلو یہی فلیٹ میں ہی سہی" اور وہ پھر بے پروائی سے ہنسا —— اور وہ دونوں فلیٹ کی طرف ہو لئے۔ جب وہ سیڑھیاں طے کر رہے تھے تو نوجوان نے اچانک ڈیزی کو اپنی طرف کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور اس کے ہونٹوں پر بوسہ دینے کے لیے جھکا۔ ڈیزی کو اس کی سانس اپنے ہونٹوں سے چھوتی ہوئی معلوم ہوئی، اور اس پر ایک عجیب سا نشہ طاری ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ نوجوان کے ہونٹ آگ کی وہ جلتی ہوئی قاشیں اس کے ہونٹوں کو چھوتیں، کسی نے اس سے مدھم آواز میں پوچھا۔
"میری جان، یہ میری چھاتی میں کیا چبھ رہا ہے، تمہارے گلے میں کیا ہے۔"
اور اس نے اسی انوکھے نشے میں چور ہو کر جس سے اس کے جسم کی رگ رگ پر کیکپی طاری ہو رہی تھی جواب دیا —— "کچھ نہیں پیارے یہ محض پیتل کی ایک زنجیر ہے۔ یہ میری ماں کی نشانی ہے، کہو تو اسے اتار دوں" ——
"پیتل کی زنجیر" وہ مدھم آواز پھر اس کے کانوں میں پہنچی "یہ پیتل ہے، کیا تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو"۔
"نہیں جانی" اس نے اسی لذت میں مدہوش اور متوالی ہو کر جواب دیا۔ "یہ پیتل ہی ہے! پر تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو میں اسے اتار کر پھینکا دیتی ہوں" —— مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے اتار کر پھینکتی —— اندھیرے میں کسی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔
"تو یہ سونے کی نہیں پیتل کی ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس کی کمر کے گرد

نوجوان کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی، اور وُہ اسے زور سے دھکیل کر اندھا دھند سیڑھیاں اُترنے لگا، ڈیزی اس وقت اپنے آپ میں نہ تھی اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اِس کی زندگی کا بہترین خواب پُورا ہوگیا ہے۔ اس کے دِل کی وُہ آرزو جسے وہ برسوں سے اپنے دِل میں چھپائے بیٹھی تھی پھولوں کے گہنے سجا کر کال کوٹھڑی سے باہر نکل آئی ہے، اور اب وہ اس کے ارد گرد ناچ رہی ہے۔ چھم چھم چھم، اس کے کان رقص کا مدھم نغمہ سُن رہے تھے۔ وہ اس کی بلائیں لے رہی ہے۔ مِس ڈیزی ہاں وہ فلاور نرسنگ ہوم کی نرس مِس ڈیزی کے قربان ہو رہی ہے اور مِس ڈیزی دلہن بنی بیٹھی ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی سیج۔ سُرخ بلاؤز، مہین ریشمی ساڑھی اور پھولوں کے جھرمٹ میں چھپی بیٹھی ہے اور ——— اور کوئی آہستہ آہستہ اس پر جھک رہا ہے، ایک جانا پہچانا مسافر اس کے سفرِ زندگی کا ساتھی، اس کا انوکھا محبوب، اور اس کی سانس سے امرت برس رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے وصال سے پہلے ہی شہد ٹپک رہا ہے میٹھا، رسیلا اور خوشبودار شہد، جو اس کی رُوح میں مسرت کی کپکپی پیدا کر رہا ہے اور وُہ مدہوش ہو رہی ہے، وہ مدہوش ہو رہی ہے ——— اور پھر اچانک کچھ ایسا ہؤا کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ کیا ہو رہا ہے، اسے یُوں معلوم ہؤا جیسے کسی نے اس کے ہونٹوں پر ٹپکتا ہؤا شہد چھین لیا ہے اس کے چہرے پہ برستا ہؤا امرت برباد کر دیا ہے۔ اس کا سُرخ بلاؤز پھاڑ دیا ہے۔ اس کی ریشمی ساڑھی تار تار کر دی ہے، اور اس کے اِرد گِرد لپٹے ہوئے پھُول نوچ لیئے ہیں مسل دیئے ہیں۔ برباد کر دیئے ہیں۔ اور اسے برہنہ کر کے بازار میں

دھکیل دیا ہے۔ اس کا ذہن اس اچانک حادثے سے ہل گیا اور وُہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ ٹکرائی اور پھر بے حس ہو کر ایک سیڑھی پہ گر پڑی ——

جب اسے دوبارہ ہوش آیا، تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی اندھیری سیڑھیوں میں تنہا۔ بالکل اکیلی پڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف ایک بھیانک سناٹا طاری ہے۔ اِس سناٹے کی شدت نے اِسے بے حد نڈھال کر دیا اور اپنی شکست اور تنہائی پہ اچانک اُس کا دِل بھر آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسُو جاری ہو گئے ——

پھانسی

"کاما" کے فلیٹ سے نیچے اُتر کر جب ویریندر ہتیارتھی فٹ پاتھ پر پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے آپ کو اوپر ہی بھول آیا ہے۔

تھوڑا عرصہ پہلے جب وہ اسی فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو وہ ایک دیوتا تھا جو اپنی ایک نئی پجارن کاما کے ہاں چائے پینے کے لئے جا رہا تھا۔ جب اُسے کاما کا حنائی، خوشبو میں بسا ہوا دعوتی رقعہ مِلا تو اس نے سوچا کہ "چائے کی دعوت تو خیر ایک بہانہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل یہ لڑکی اُس دیوتا کو دیکھنا چاہتی ہے جس کے افسانوں نے اُس کے دِل کے اندھیرے میں ننھے ننھے دِیئے جلا دیئے ہیں"۔ یہ سوچ کر اس کے مُونچھوں بھرے ہونٹوں میں ہنسی تڑپ اُٹھی۔ اپنے متعلق وُہ ہمیشہ اِسی طرح سوچتا تھا۔ اور دیوتا بننے

کے شوق میں اُس نے سر کے بالوں اور داڑھی کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ ان میں اس کی اصلی شکل کہیں گم ہو گئی تھی۔ بچپن میں وہ ایک آوارہ گرد تھا، جنگلوں، پہاڑوں اور دیہاتوں سے اسے بہت محبت تھی، چنانچہ گھر سے بھاگ کر جب وہ ان علاقوں میں گھومتا تو اسے ہر طرف رسیلے گیتوں کی تانیں سنائی دیتیں اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ گیت نہیں بلکہ دیئے ہیں۔ ننھے ننھے جھلملاتے ہوئے دیئے جو ان جنگلوں پہاڑوں اور دیہاتوں کی تاریکی کو اُجال رہے ہیں اس سحر کاری پر اس کا دل تڑپ اُٹھا، اور اس نے ان گیتوں کے متعلق لکھنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ وہ افسانہ نگار بن گیا، وہ عام طور پر انہی گیتوں کے متعلق افسانے لکھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ انہیں پڑھ کر لوگوں کے تاریک دلوں میں ننھے ننھے دیئے جل اُٹھیں گے۔ چنانچہ اس کے قول کے مطابق اُس نے اسی موضوع پہ بے شمار افسانے لکھ کر ایک دیپ مالا رچا دی تھی جس کی روشنی سے اس دیس کا حسن نکھر آیا تھا، وہ اپنے افسانہ نگار دوستوں میں یہ بات بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ کہ بھئی میں تو ایک آوارہ گرد آرٹسٹ ہوں، مشینوں کی ہماہمی اور کارخانوں کے غلیظ دھوئیں سے دُور ہی رہتا ہوں، اور اُن لوگوں کے دلوں کی دھڑکن سنتا ہوں جن کے سینے ہوس سے خالی اور چہرے زہرخند سے پاک ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے دیہاتوں میں اندھیرا ہے، یہ ٹھیک ہے مگر ہندوستان کے شہر بھی تو تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ شہروں کی تاریکی میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور چیخوں کی آوازیں ہیں جو تاریکی کو اور بھی گہرا کر دیتی ہیں اور

دیہاتوں کے اندھیرے میں امن و مسرت کے نغمے سنائی دیتے ہیں جو ننھے دیئوں کی صورت میں جھلملا اٹھتے ہیں اور آس پاس اجالا پھیلاتے ہیں میں انہی دیئوں کو شہروں میں جلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں دیوتا ہوں، امن اور کویتا کا دیوتا، کیوں بھئی میں دیوتا نہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس کی لمبی داڑھی اور مونچھوں کے بال جیسے جھومنے لگتے اور وہ اپنے آپ کو ہمالہ پربت سے بھی اونچا سمجھنے لگتا، اس کی بیوی واقعی اسے دیوتا ہی سمجھتی تھی، اگر وہ اسے دیوتا نہ سمجھتی تو شادی کے بعد ویرندر کی آوارہ گردی ختم ہو گئی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا، وہ شادی کے بعد بھی جنگلوں پہاڑوں اور دیہاتوں کی خاک چھانتا رہا مگر اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی، ایک سانولی اور دبلی پتلی عورت جو دیوتا کو ایک ان جانے سحر سے بچانے آئی تھی۔ مگر خود بھی اسی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی، ویرندر اپنی بیوی سے بہت کم باتیں چھپایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بہترین مشیر ہے۔ کئی دفعہ بعض ایسے مسئلوں کے متعلق جنہیں سوچ سوچ کر وہ تنگ آ چکا تھا، اس نے ایسے مشورے دیئے کہ ویرندر حیران رہ گیا۔

"بھئی حد ہو گئی" وہ تعجب سے کہتا "تم عورت نہیں دیوی ہو۔"

اس کی بیوی ایک دلکش انداز سے مسکراتی اور اس کے ہونٹ دلفریب خم کھا جاتے:

"او ہوں! دیوی نہیں بلکہ دیوتا کی پجارن" — وہ آہستہ سے کہتی اور ویرندر پھر اپنے آپ کو ہمالہ پربت سمجھنے لگتا جس دن وہ زندگی کے سفر

میں دو سے تین ہوئے یعنی اس کی بیوی نے ایک ننھی منّی بچی کو جنم دیا تو ویریندر بڑا چکرایا۔

"یہ بچّی اب ہمیں شاید کہیں نہ گھومنے دیگی" اس نے سوچا اور اس نے فکرمند ہو کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا اب ہم سفر کر سکیں گے؟"

"کیوں نہیں" بیوی نے اس کے دل کی بات جان کر کہا۔ "میری بچی دیوتا کی بیٹی ہے، تم اس کی شکل نہیں دیکھتے، کتنی موہنی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دیوتا نے شاعری کی ہے، جب یہ بڑی ہوگی تو ہمارے ساتھ ہی اُڑی پھریگی۔"

ویریندر ہنسا اور اس کا دل خوشی سے پھول گیا، اب وہ دو کی بجائے تین ہوگئے اور ان کے لئے دنیا پہلے سے زیادہ حسین ہوگئی، وہ تینوں حسب معمول پھر گھومنے لگے اور جب اچانک ویریندر کے افسانوں میں ایک ننھی سی لڑکی کا ذکر آنے لگا جو اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دُور دراز حصوں میں بکھرے ہوئے گیتوں کو چُنتی پھرتی تھی تو لوگوں کو پتہ چل گیا کہ اب اُن کا ننھا ساتھی چلنا پھرنا اور بولنا بھی سیکھ گیا ہے وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور اُن کی زندگی خلوص، وفا اور اعتماد کے جذبوں سے معمور تھی، ویریندر کی بیوی کو فخر تھا کہ اس کا شوہر ایک دیوتا ہے اور اس کی بیٹی اُس کی لمبی داڑھی اور بالوں سے بیحد مانوس تھی، ویریندر کو بھی اس بات کا علم تھا، چنانچہ اس نے اپنی شہرت کی بنیادیں انہی دو چیزوں پر استوار کی تھیں، لمبی داڑھی اور گردن سے بھی نیچے پہنچتے ہوئے سیاہ بال، ہندوستان کا یہ خانہ بدوش افسانہ نگار زیادہ تر اپنی اسی فقیرانہ وضع کی وجہ سے مشہور تھا۔ عام لوگ اسے درویش

سمجھتے تھے اور یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے اسے عزّت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ویرندر کو اپنی بیوی پر بڑا بھروسہ تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک عقلمند عورت ہے، چنانچہ اس نے اُسے کئی ایسی باتیں بھی بتا دی تھیں جسے مرد عورت کو بتانا کبھی پسند نہیں کرتا، مگر اس روز کاما کا خط پاکر اس کے دِل میں ایک عجیب قسم کی خواہش پیدا ہوئی، اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی بیوی کو بتائے بغیر کاما کے ہاں چلا جائے تو کیسا رہے، اُس کے دِل کے اندر سے کوئی مسکرا کر بولا، کیسا رہے؟ خُوب رہے، کاما کے ساتھ چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے جب تمہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ تمہارے یہاں آنے کا تمہاری بیوی کو کوئی علم نہیں، تو اس احساس کی لرزش تمہارے سینے میں جو لذت پیدا کر دے گی۔ اُس سے تم آج تک محروم ہو ——— اسے یہ مشورہ پسند آیا اور وہ اپنی بیوی کو بتائے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے، چپکے سے گھر سے نکلا اور کاما کے مکان کی طرف ہولیا۔ جب وہ اُس کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو وہ ایک دیوتا تھا اور دیوتا سوچ رہا تھا کہ اس کی نئی پجارن کیسی ہوگی، شائد وہ کوئی دیوداسی ہو۔ کشمیر کے نغمے کی طرح حسین، پُرسوز اور دلفریب یا وہ رات کے بالوں میں گُندھی ہوئی کہکشاں کی طرح ہو بے شمار ستاروں کی انوکھی خوشبوؤں کا عطر اس کے مرمریں جسم میں مہک رہا ہو۔ یا وہ ایک سانولے رنگ کی رسیلی اور البیلی عورت ہو۔ گداز رس بھری کی طرح جس کا رس ہاتھ لگتے ہی پھُوٹ پڑنے کو تیار ہو، یا شائد وہ کچھ بھی نہ ہو فقط ایک عورت ہی ہو ایک ایسی عورت جسے دیکھ کر ذہن میں کوئی احساس پیدا نہ ہو۔ نہ محبت نہ نفرت، نہ خوشبو نہ تعفن، فضا خالی خالی سی نظر آئے جیسے اس میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہو۔ یہی

سوچتا ہؤا وہ سیڑھیاں ختم کر کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہؤا تھا اور کمرے کے اندر سے پیانو کی دلکش سُریں نکل رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا اور اس ہوا کو جس میں پاگل بنا دینے والی جسمانی خوشبو رچی ہوئی تھی اپنے سانسوں میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔ ویریندر کا دل بھی تو کسی نغمے کا انتہائی سُر تھا جو ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ پیانو کے راگ پر اس کا سارا جسم تال دینے لگا، اُڑنے لگا، ناچنے لگا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے سر اور داڑھی کے بال گِر گئے ہیں۔ پُرانی تہذیب کے ستون زمیں بوس ہو گئے ہیں اور ملبے کے مکروہ ڈھیر میں سے ایک حسین چہرہ، نئی تہذیب کا روشن نشان مسکراتا ہؤا نکل آیا ہے۔ اس احساس نے اس کے جسم میں تھرتھری سی پیدا کر دی اور اس نے گھبرا کر دروازہ کھٹکھٹایا ——

"کون" —— ایک رسیلی آواز آئی اور پیانو کا راگ بند ہو گیا —— پھر قدموں کی چاپ دروازے کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی اور ویریندر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ آنکھیں بن کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا، پاؤں کی مدھم چاپ اس کے بالکل قریب آ کر رُکی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا —— ویریندر کا دھڑکتا ہؤا دل اچانک بےحس و حرکت ہو گیا، جیسے اس پر کوئی انوکھی لذّت طاری ہو گئی ہو۔ مٹا دینے والی، بےرحم مگر جان سے زیادہ عزیز لذت جس میں بیک وقت مسرّت اور قہر کے جذبے پائے جاتے تھے، اس کی آنکھیں دروازے میں جھانکتی ہوئی لڑکی پر جمی کی جمی رہ گئیں، اور اس کے اندر سے کسی نے کہا، یہ وہی لڑکی ہے، جس نے تمہیں چائے پر بلایا ہے

یہ اس دیوتا کو دیکھنا چاہتی ہے، جس کے افسانوں نے اس کے تاریک دل میں دیپ مالا رچا دی ہے۔ خاموش کیوں ہو آگے بڑھ کر کہو کہ میں ویریندر ہتیارچی ہوں، سوچتے کیا ہو، تمہاری بیوی کو کوئی علم نہیں کہ تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔ چلو بڑھو، کہو کہ میں ہی ویریندر ہتیارچی ہوں ——— اور ویریندر نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکن پھر گونجنے لگی ہے، اس کے جسم کے پُرشوق ذرے اسے کچھ کہنے اور کچھ کرنے پر اکسا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ قدم آگے بڑھ کر اس نے کہا، "میں ویریندر ہتیارچی ہوں"۔

"تشریف لائیے" لڑکی نے پورا دروازہ کھول کر کہا۔ "میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی" ———

ویریندر نے چاہا کہ وہ مسکرائے مگر اس کے ہونٹ اس کی بھاری مونچھوں کے بوجھ سے تڑپ کر رہ گئے۔ اس وقت اس نے سوچا کہ دیوتا بننا کس قدر مشکل ہے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ چکا تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی پیدا ہو گئی اور اس نے اپنے اِرد گرد ہر شے کو دیکھنا شروع کیا۔ کاما تو اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی مگر اس کا نفاست پسند اور آرٹسٹک مزاج سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز اس کی اپنی شکل کی طرح حسین اور موزوں تھی، ویریندر نے سوچا کہ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں اس کے جسم کے خطوط کی طرح نازک ہیں اور پیانو کی دھاریاں اس کی انگلیوں کی طرح پتلی اور دلفریب اور صوفے اس کے جسم کی طرح گداز اور شیریں اور میزوں پر رکھے ہوئے گلدان اس کے کولھوں کی طرح بھرپور اور شاداب اور ان میں سجے ہوئے

پھول اس کے ہونٹوں کی طرح سُرخ اور شگفتہ اور شیلف میں قرینے سے رکھی ہوئی کتابیں اس کی ناک کی طرح ستواں ——— اور شائد وہ اسی طرح سوچتا چلا جاتا اگر اس کی نگاہیں شیلف میں رکھی ہوئی اپنی کتاب پر نہ جا پڑتیں، اس کی اپنی کتاب جس پر اس کا داڑھی اور سر کے بالوں سے بھرا ہوا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے بادلوں کے ہجوم میں سے بجلی کی شعاع جھانک رہی ہو، اور پھر اچانک اس کی نظر کاما پر جا پڑی، جو اپنی مسکراتی ہوئی اور چنچل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی لمبی داڑھی اور گردن سے نیچے پھیلے ہوئے سر کے بالوں کی طرف، اس کے لمبے کوٹ کی طرف، جو دو سال سے دُھلا تک نہیں تھا، اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرف جن میں ایک ٹیڑھی ہونے کے باعث چھوٹی چھوٹی سی معلوم ہوتی تھی، اس نے اُن نگاہوں میں جو اس کے جسم پر بیباکانہ پھسل رہی تھیں، ایک شدید طنز محسوس کی، ایک جلا دینے والی، پھونک کر راکھ بنا دینے والی طنز، جس میں شکوہ نہیں تھا، شکایت نہیں تھی، بلکہ تضحیک تھی، نشتر کی طرح تیز اور زہر کی طرح تلخ تضحیک، اور یہ تضحیک جیسے ویریندر کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی اور اس نے ایک ان جانے اور بھیانک سمندر کی لہروں سے خوفزدہ ہو کر جو اسے ہر لحظہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، کانپ کر کہا،

" تو مس ——— (معاف کیجئے مجھے معلوم نہیں کہ آپ مس ہیں یا مسنر) کاما، میں آپ کا بڑا ممنون ہوں، کہ آپ نے میری اس قدر عزت افزائی کی"———

معلوم نہیں یہ اس کا وہم تھا یا واقعی کاما اس کی آواز سُن کر چونک پڑی

شائد اس کی آواز ٹھیک نہ تھی، شائد اِس نے کاما کو اُونچی آواز سے مخاطب کیا تھا مگر نہیں اس کی آواز اس قدر اُونچی تو نہ تھی کہ کاما چونک ہی پڑتی، تو پھر اس کی آواز باریک نکلی ہوگی، ہاں یہ ہو سکتا ہے، اس کے دوست یہی کہتے تھے کہ اس کی آواز بہت باریک ہے، جیسے۔ جیسے ——— پیانو کا مدّھم سُر اس نے اپنی آواز کو یہ تشبیہ دے کر خود ہی اپنی ہنسی اُڑائی لیکن اس کا دِل شرمندہ ہونے کی بجائے یُوں ہنسنے لگا جیسے اِس نے یہ فقرہ اپنے آپ پر نہیں بلکہ کسی دُوسرے پر چسپاں کیا ہو ———

کاما نے جو اس کا فقرہ سُن کر ایک لمحے کے لئے مُسکرانے لگی تھی، اپنے سُرخ بلاؤز کی ایک سلوٹ کو دُرست کرتے ہوئے کہا ۔ "جی نہیں ۔ ممنون تو مجھے ہونا چاہئیے کہ آپ نے میری دعوت قبول کر کے اس جگہ آنا گوارا کیا۔ مجھے آپ کی گیتوں بھری کہانیاں بیحد پیاری لگتی ہیں، اور انہی نے مجھے شوق دلایا کہ میں اِن کے مصنف سے ملوں" ———

"جی اچھا" ——— ویرندر کی داڑھی اور مونچھیں اچانک پھولنے لگیں۔ اور اسے یُوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہمالہ پربت ہے اور اِس کمرے میں نہیں سما سکتا ——— "میری کہانیاں اچھی ہیں"۔ اِس نے اپنے دِل میں سوچا "کاما بھی یہی کہتی ہے، میری بیوی بھی یہی کہتی ہے اور میرے دوست بھی، پھر تو میں اس دیس کا سب سے بڑا آرٹسٹ ہوں، آرٹسٹ نہیں دیوتا، ٹیگور اور کالی داس سے بھی کہیں بڑا دیوتا، میرے ادبی مندر میں اس وقت تک پھول چڑھتے رہیں گے۔ جبتک کوئی اس مندر ہی کو نہ گرا دے گا" ——— اور اب

اس کا احساسِ برتری جاگ اُٹھا، اور اس احساس کے ساتھ ہی اس میں بے نیازی پیدا ہو گئی —— اُس نے ایک دفعہ پھر اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو گھمایا اور کہا——

"جی بڑی خوشی ہوئی کہ میرے افسانے آپ کو پسند ہیں، دراصل میں جب ادبی سمندر میں اپنا جال ڈالتا ہوں، وہاں ایسی ہی سنہری مچھلیاں ملتی ہیں، ہیں جی! میں ہندوستان کے دُور دراز حصوں میں بکھرے ہوئے موتیوں کا جوہری ہوں آپ نے پڑھا ہو گا جی؟ میں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ میں اب گھوم گھام کر اپنا کچکول لئے ادبی دُنیا میں آنکلا ہوں، مگر یہ کچکول خالی نہیں جی بلکہ اس میں گاتے ہوئے ہندوستان کی رُوح کا پسینہ چمک رہا ہے"—— ابھی ویرندر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے یُوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز زیادہ باریک ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ رُک گیا، کاما جو اس کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی، حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ایک کالی کلوٹی بُوڑھی عورت جو شاید مدراس کی رہنے والی تھی، بغلی دروازے سے اندر آئی اور کہنے لگی——

"بی بی چائے لے آؤں"——

"کاما نے ایک مدھم اور نرم ہاں کہی جیسے ساون کی پہلی پھوار نے گلاب کا منہ چُوما ہو اور پھر ویرندر کی طرف دیکھنے لگی۔ ویرندر کو جیسے ہوش سا آ گیا، اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے جو کاما کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ایک لفظ کو ساون کی پھوار کے پیار سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ مگر نہیں وہ تو کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے، ایک دیوتا، ٹیگور اور کالی داس سے بھی بڑا دیوتا چنانچہ اس نے

کہا ——— "جی تو میں کہہ رہا تھا کہ میں دُوسرے افسانہ نگاروں سے ذرا مختلف ہی ہوں، میرا آرٹ حقیقی بنیادوں پر قائم ہے، اِس کی جڑیں پاتال میں چلی گئی ہیں، ہیں جی؟ آپ نے میرے افسانے پڑھ کر اندازہ لگا ہی لیا ہو گا کہ ———

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" کاما اس کی بات کاٹ کر بولی "آپ کے افسانوں میں واقعی اُس ہندوستان کی جھلک نظر آ رہی ہے، جس کی آواز مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں نہیں دبی بلکہ بلند ہوتی چلی جا رہی ہے، اور کون جانے مستقبل میں یہی نغمہ ایک ابدی حیثیت اختیار کر لے" ———

"جی ہاں" ویریندر کے ہونٹوں سے نکلا اور وُہ پھر سوچنے لگا کہ کاما کو اِس سے کتنی عقیدت ہے، وہ ایک دیوتا ہے اور کاما اس کی پجارن، کیا یہ پجارن صرف دیوتا کے شبدوں ہی کو پسند کرتی ہے، یا اِسے دیوتا سے بھی کچھ لگاؤ ہے، چنانچہ اس کا جی چاہا کہ وُہ کاما سے پُوچھے کہ اسے اُس کی داڑھی کیسی لگتی ہے، مگر اچانک کاما کی کالی کلوٹی ملازمہ چائے لے آئی، اور میز پر کھانے کی چیزیں دیکھ کر اس کے دل کے ایک حصّے نے مچلنا شروع کر دیا ——— دیوتا اور پجارن کا قصہ پُرانا ہے مگر اس سے بھی زیادہ پُرانی کہانی انسان اور بھوک کی ہے، اِس لئے پہلے چائے پیو اور پھر کوئی اور بات کرو" ——— اور ویریندر گفتگو چھوڑ کر پچکے سے میز پر جھک گیا ———

جب وُہ اتنا کچھ کھا چکا کہ اس کے بعد چائے کی ایک پیالی ہی کی گنجائش رہ گئی تو وہ پھر دیوتا بننے کی کوشش کرنے لگا، اپنے متعلق بڑے شاندار فقرے اور عظیم الشان تشبیہیں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں، اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں

فوراً کہہ دے، مگر ایک چیز بڑی بُری طرح اُس کے آڑے آ رہی تھی، یعنی، اس کی لمبی داڑھی، جو باتیں کرتے وقت ناک کے بوجھل پرندے کی طرح جھولنے لگتی تھی اس داڑھی سے وہ اس وقت بڑا تنگ آیا ہوا تھا، اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے شمار فائدوں سے محروم ہو جائے گا، اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا معجزہ ہو کہ وہ کاما سے باتیں کرتا کرتا داڑھی کو اُتار کر بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لے اور کہے ـــــ "جی تو آپ نے دیکھا کہ میں کس قدر بڑا آدمی ہوں، ہیں جی، داڑھی کا صفایا کرنا تو ایک معمولی بات ہے اگر آپ کہیں تو ـــــ ہیں جی ـــــ تو خیر چلیے ـــــ"

مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی داڑھی اتنی نرم نہیں، اور نہ دیوتا ہونے کے باوجود وہ ایسا شعبدہ دکھا ہی سکتا ہے کہ جب جی چاہے داڑھی اتار لے اور جب جی چاہے اسے لگا لے، کم از کم اس وقت وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ خاص خاص موقعوں پہ ایسا کر سکے، مثلاً اسی وقت جب وہ کاما کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، مگر ـــــ مگر ـــــ اس نے ناکامی کے احساس سے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگا ـــــ

جب وہ چائے ختم کر چکے تو اس نے حسبِ معمول کاما سے کمرے میں لگی ہوئی تصویروں، کرسیوں اور کتابوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا، یہ تصویر کس نے بنائی، یہ کرسی تو لاجواب ہے اور یہ کتاب بھئی واہ وا ـــــ میں نے جب اسے پڑھا، تو تین دن تک میں بھولا ہی رہا کہ میں کون ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ اسی قسم کے بے شمار سوال اور باتیں وہ کرتا رہا اور کاما کے ساتھ ساتھ کمرے میں پھرتا

رہا جو اسے ہر شے کا حسن قریب سے دکھا رہی تھی۔ جب وہ سب کچھ دیکھ چکا تو اس کی نظر پیانو پر پڑی —— اور اس نے چپکے سے کاما کو اپنی خواہش بتلا دی—

"وہ —— کاما —— آپ ذرا پیانو نہیں بجائیں گی۔ آپ جانتی ہی ہیں میں موسیقی سے محبت کرتا ہوں ——"

کاما مسکرائی۔ دیوتا خود پجارن کے ہاں چل کے آیا تھا؟ اس لیئے وہ اس کی کوئی خواہش رد نہ کر سکتی تھی، چنانچہ وہ پیانو پہ بیٹھ گئی۔ اس کی انگلیاں پیانو کی دھاریوں پر لرزیں اور پھر ہوا میں سینکڑوں نئے سُر جاگ اُٹھے۔ دیویندر کا دل دھڑکنے لگا، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اُڈنے لگا، ناچنے لگا، اور وہ بھول گیا کہ وہ ایک دیوتا ہے، ٹیگور اور کالی داس سے بھی بڑا دیوتا، ہمالہ پربت سے بھی اونچا، اور اس وقت وہ ایک معمولی آدمی بن گیا، تصنع اور ریاکاری سے پاک ایک چھوٹا سا انسانی وجود جو موسیقی کی لہروں میں سمٹ رہا تھا، جذب ہو رہا تھا، اپنے آپ کو کھو رہا تھا —— اور پھر دیویندر کی رُوح تو ایک نغمے کا انتہائی سُر تھی جو ناتمام ہی رہ گیا تھا، اور شاید اسی وجہ سے وہ مضطرب تھا، اس کے جسم میں ایک ناکام تخلیق بیقرار تھی، بےچین تھی، وہ مکمل ہونا چاہتی تھی جس طرح بھی ہو اپنے آپ کو اکٹھا کرنا چاہتی تھی، جوڑنا چاہتی تھی، اسی لیئے وہ کبھی آندھر دیش کی خاک چھانتی پھرتی تھی اور کبھی کشمیر کی حسین وادیوں میں گھومتی تھی، دیویندر اپنے سینے میں اس کا بوجھ لیئے مدت سے گھوم رہا تھا۔ اس کو کہیں قرار نہیں ملتا تھا۔ اس کی روح کو نئے نئے نغموں اور موسیقی کی انوکھی تانوں کی چاہت تھی —— اور وہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیئے اپنی داڑھی سمیت چکلوں

تک میں چلا جاتا تھا ـــــ مگر یہ تو چکلہ نہیں تھا، یہ تو کاما کا فلیٹ تھا اور وہ لیٹے پیانو پہ گا رہی تھی، ویریندر کے دل میں اس موسیقی کی تال پر ایک عجیب سی تھرکن پیدا ہو گئی اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا تھا، کاما کی موسیقی سے بے شمار سُر نکل کر اس کے جسم کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس میں یوں ڈوب رہے تھے جیسے وہ ایک سمندر ہو ایک ازلی اور ابدی سمندر، جہاں سے انہوں نے جنم لیا ہو اور آخر کار جہاں وہ واپس جا رہے ہوں اسے یوں معلوم ہونے لگا، جیسے وہی ان سُروں کا منبع ہے، جیسے وہی گیتوں کو جنم دیتا ہے، اسے اپنا وجود بھی ایک سمندر معلوم ہونے لگا، ایک ازلی اور ابدی سمندر جس میں گیت جنم لیتے ہوں، پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ بیک وقت سمندر بھی ہے اور دیوتا بھی، گیتوں کا دیوتا، اور اس کی روح میں چھپی ہوئی ناکام تخلیق کے زخم جیسے کاما کی موسیقی سے بھرنے لگے۔ اس کی روح کا گیت مکمل ہونے لگا، اور اپنے وجود کے ذرّے ذرّے میں وہ ایک نئی امنگ محسوس کرنے لگا، اس نے سوچا وہ دُنیا میں اسی ازلی نعمت کو پھیلانے آیا ہے، اس کی ہستی کا مقصد یہی ہے، کہ وہ اس تاریک دُنیا میں میٹھے گیتوں کی دیپ مالا رچائے وہ دیوتا نہیں بلکہ ایک گیت ہے، کائنات کا ایک میٹھا گیت، ایک انسان، جو خود دیوتاؤں سے زیادہ عظمت رکھتا ہے۔ جو دیوتاؤں کے بُت تراشتا ہے، جو یہ ایک سوانگ رچا کر خود ہی مندروں میں پھول چڑھاتا ہے، نہیں نہیں، اس نے رچا میں دیوتا نہیں ہونگا، میں انسان ہوں، انسان ہی رہونگا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی لمبی داڑھی اور سر کے بال خود بخود علیحدہ ہو کر زمین پر جا گرے ہیں۔ مکاری کے سیاہ بادل اُس کے چہرے سے ہٹ گئے ہیں، اور ان

میں سے اس کا روشن چہرہ نکل آیا ہے، صاف، انسانی اوصاف سے معمور چہرہ۔ —— اور وہ مسکرا کر کاما کی طرف بڑھا —— اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا،

اچانک کاما نے گانا بند کر دیا۔ موسیقی کے سُر ٹوٹ گئے اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ایک بھیانک سناٹا اور دیبندر کو معلوم ہُوا کہ ابھی تک اسکی داڑھی ناٹک کے بوجھل پردے کی طرح اس کے چہرے پر جھول رہی ہے۔ اس احساس نے اسے شدید اذیت پہنچائی اور اس نے چاہا کہ اس واہیات داڑھی کو نوچ ڈالے، اور ان لمبے لمبے سیاہ بالوں کو جنہوں نے اس کے چہرے کو تاریک بنا رکھا تھا۔ ہوا میں اُچھال دے اور چلا چلا کر کہے "اب میں دیوتا نہیں رہا۔ میں نے بزرگی کو مار ڈالا ہے۔ اپنی مصنوعی عظمت کو فنا کر دیا ہے۔ اب میں انسان ہُوں ایک معمولی انسان، اور میں اسی لیئے بڑا ہُوں کہ میں ایک انسان ہُوں میں ایک انسان ہُوں، میں ایک انسان ہُوں" —— اور ایکا ایکی ایک انسانی آواز، کاما کی رسیلی صدا، اس کے کانوں میں پہنچی ——

"کہئے گیت پسند آیا" وہ پُوچھ رہی تھی۔

"ہاں" اُس نے جیسے بے خیالی میں جواب دیا، اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی خیال بسا ہُوا تھا۔ اپنی داڑھی اور سر کے بالوں کی فراوانی کا اذیت بخش خیال —— اور وہ بُھول چکا تھا کہ وہ خود ایک دیوتا ہے۔

بڑا دیوتا، اور دیوتا سوچا نہیں کرتا صرف دیکھا کرتا ہے۔ لیکن اب تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور بھی دُھندلی ہو گئی تھیں اور اس دھندلاہٹ میں قسمہ

ایک اور ویرندر ہتیارجی کو دیکھ رہا تھا، جس کی داڑھی غائب ہو چکی تھی اور سر کے بال بڑے سلیقے سے کٹے ہوئے تھے، اور وہ مسکرا رہا تھا، اس کے ہونٹوں کے خم بڑے واضح تھے۔ اس کے چہرے کا ایک ایک خط صاف اور روشن تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دھندلی آنکھوں میں بھی ایک دلفریب چمک نمودار ہو گئی تھی، وہ اب دیوتا نہیں تھا۔ بلکہ انسان تھا، زندگی کے تمام جذبے اس کی رگوں میں مچل رہے تھے، بیباک اور دلیر جذبے جو رُوح کی گہرائیوں میں جنم لیکر خون کی لہروں پر تیرتے پھرتے ہیں، اور دیوتا ویرندر ہتیارجی، انسان ویرندر ہتیارجی کو دیکھ کر انہی جذبوں کے ساتھ بہنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں برسوں سے جمی ہوئی سیاہی پگھل رہی ہے اور وہ بہت دیر مفرور رہ کر اب پھر اپنے اصلی دیس کو لوٹ رہا ہے، اس احساس سے اس کی رُوح پر اتنی شدید کپکپی طاری ہوئی کہ اس کا رواں رواں کانپ اُٹھا اور جیسے اس نے ہوش میں آکر دیکھا کہ کاما کی بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ اس نے اپنی خود فراموشی کو محسوس کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہونٹ پہلے کی طرح مونچھوں کے درمیان ہی تڑپ کر رہ گئے، اسے ایک اور چرکا لگا، اور اسے ناقابلِ برداشت پا کر اس نے کاما سے کہا ـــــ

"اچھا جی تو پھر ـــــ میں چلتا ہوں۔"

"کیوں ـــــ بیٹھئے گا نہیں" کاما کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"جی نہیں" ویرندر اس وقت کوشش کے باوجود اپنے آپ کو بے بس پا رہا

تھا۔

"اب تو میں جاؤں گا ہی ـــــ بات یہ ہے کہ وقت کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اور مجھے ابھی ایک ضروری کام بھی کرنا ہے۔ اس لئے میں پھر کبھی حاضر ہوں گا ـــــ یہ کہکر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہاتھ جوڑ کر کاما کے فلیٹ سے نکل آیا ـــــ اور جب وہ کاما کے فلیٹ کی سیڑھیاں اُتر کر فٹ پاتھ پر پہنچا تو اسے یوں معلوم ہُوا جیسے وہ اپنے آپ کو اوپر ہی بھول آیا ہے۔

× × × ×

سڑک پر بجلی کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں، لوگ آنکھوں میں ایک دلگیر سی روشنی لئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ آسمان پر دُھندلے اور زرد ستاروں نے کانپنا شروع کر دیا تھا اور فضا میں بے شمار آوازوں کی بے معنی گونج سُنائی دے رہی تھی۔

دیریندر ہتیارچی اب آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر ہو لیا تھا۔ اور اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پتھرائی ہُوئی آنکھوں کو بار بار جھپکتے ہُوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اُس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے، کوئی ایسی بیش بہا چیز جس کے گم ہو جانے کے بعد اس کا وجود انڈے کے خالی چھلکے کی طرح رہ گیا ہے، بالکل بیکار، بے فائدہ اور بے معنی، اور اس کا جی چاہ رہا تھا، کہ یونہی چلتے چلتے اچانک سڑک پر گذرتی ہُوئی کسی موٹر کے سامنے کود پڑے، یا کسی تانگے کے نیچے آ جائے یا اگر کچھ نہیں تو بجلی کے کسی کھمبے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے، وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کھو بیٹھا ہے، اس کے جسم کا اصلی جوہر کہیں گم ہو گیا ہے، کاما کے فلیٹ پر ہی رہ گیا ہے، اور اب اس کے پاس کیا ہے ایک مصنوعی

جسم، جس پہ مصنوعی داڑھی ناٹک کے بوجھل پردے کی طرح جھول رہی ہے اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ، اپنی داڑھی کی طرف اُٹھ گئے اور لمبے لمبے سیاہ بالوں پر پھسلنے لگے ۔ ان کی موجودگی کے احساس سے اُسے بہت دُکھ ہوا اور اس نے سوچا کہ اگر کوئی راہ گیر اسے روک کر یہ کہنا شروع کر دے کہ بھئی یہ چہرے پر کیا مصیبت لٹکائے پھرتے ہو۔ بخدا کسی وقت تو میک اپ کے بغیر بھی سٹرک پر نکلا کرو، آخر گلی کوچوں میں کیوں ریہرسل کرتے پھرتے ہو" تو کیا ہو" اور اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ایک راہ چلتے آدمی نے دُوسرے کو کہنی مار کر کہا ـــــ ذرا اس فقیر کو دیکھنا بھئی ، سالا کوٹ پتلون پہنے پھرتا ہے ، تمہاری قسم اب تو گداگروں نے بھی بڑے عجیب بھیس بنانے شروع کر دیئے ہیں" ـــــ اور جس آدمی سے مخاطب ہو کر یہ فقرے کہے گئے تھے ۔ اس نے جواب دیا " واللہ کیا بات کہی ہے ۔ پورا جعلساز معلوم ہوتا ہے ، ذرا شکل تو ملاحظہ ہو، معلوم ہوتا ہے جیسے آپ ٹیگور کا پارٹ ادا کرنے کے لیئے فلم کمپنی میں تشریف لے جا رہے ہیں" ـــــ اور وہ دونوں ایک قہقہہ لگا کر آگے بڑھ گئے ـــــ ویریندر کو یُوں معلوم ہوُا جیسے وہ قہقہہ اپنی پوری جہنمی تلخی کے ساتھ اس کے عضو عضو میں سما گیا ہے اور اس کا سارا جسم ایک ایسے درد میں مبتلا ہو گیا ہے ۔ جس کا کوئی مداوا نہیں، کوئی ردِ عمل نہیں اور اس نے اس کے اندر ایک ایسی آگ لگا دی ہے جس کے شعلے تھوڑی دیر میں اس کے وجود کو جلا کر راکھ بنا دینگے۔

دھڑ ـــــ دھڑ ـــــ اس کے کانوں میں چند اَن جانی آوازیں گونجنے لگیں اور اسے یُوں محسوس ہونے لگا جیسے خطرہ مکمل

ہوگیا ہے، اس کے اندر آگ جل اُٹھی ہے اور تھوڑی دیر اس کا رُواں رُواں شعلوں کی لپیٹ میں آجائے گا، یہیں فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس کے اعضا جل جل کر گرنے لگیں گے، لوگ جلتے ہوئے گوشت کی بُو سونگھ کر اس کی طرف دیکھیں گے۔ اسے بچانے کیلئے بھاگیں گے، لیکن اس کی بے رحم آگ اسے جلا کر ہی دم لے گی "میں جل جاؤں گا؟" اس نے کچھ خوفزدہ ہو کر اپنے دِل سے پُوچھا، اور اس کے دِل نے جواب دیا۔ "تو پھر کیا ہو گا، یہی نا کہ تمہیں اِس مصنوعی داڑھی سے نجات مِل جائے گی، جسے تم یونہی بغیر کسی مقصد کے چہرے پر لٹکائے پھرتے ہو، اچھا ہے یہ نشان مِٹ جائے، خواہ اس کے لِئے تمہیں اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے"——

"جان کی قربانی" اس کے اندر چھپا ہوا کوئی اِنسان چیخ اُٹھا، "مگر کیوں میں کیوں ایک بُزدلانہ موت کا شکار ہو جاؤں مجھے اِس دُنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، ابھی تو میں اِنسان کو محبّت کا ابتدائی سبق دے رہا ہوں ابھی تو مجھے اُس سب سے بڑی تعلیم کو مکمل کرنا ہے۔ کیا میں اپنے آدرش سے غداری کروں، کیا میں اِس حقیر سی داڑھی کے بدلے خُودکشی کر لوں بھلا کیوں نہ میں اِس داڑھی ہی کا صفایا کر دُوں، اسے جڑ سے اُکھاڑ ڈالوں اس کے مکرُوہ بالوں کو ہوا میں بکھیر دُوں، میں ایسا کیوں نہ کروں میں ایسا کیوں نہ کروں"—— اِس خیال کے ساتھ ہی اِس کے اعضا جیسے اینٹھنے لگے اور اسی عالم میں وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک آدمی سے ٹکرا گیا—— "اندھے ہو۔" اُس نے غصّے سے بھر کر کہا۔

اور ویرندر نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا، تو ایک آدمی جس کے گالوں پر لگے ہوئے صابن کے تازہ دھبے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی داڑھی منڈوا کر نکلا ہے، اس کی طرف گھور رہا تھا، اس نے اپنے اندھے پن کی تصدیق کرنے کی بجائے اس سیلون کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا جہاں سے وہ نکل کر آیا تھا، اور جب اس کی نگاہ سیلون پر پڑ گئی، تو وہ اسے کچھ جواب دیئے بغیر بھاگ کر اس میں داخل ہو گیا، حجام جو ابھی ابھی داڑھی مونڈنے کے بعد فارغ ہو کر اُسترا تیز کر رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی احترام سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "آئیے سائیں جی کیا حکم ہے" ——

"بھئی جلدی سے میری داڑھی مونڈ دو اور ہاں سر کے بالوں پر بھی قینچی چلا دو" —— ویرندر نے تیزی سے کہا اور کوٹ اتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حجام نے پہلے تو اس کی بات سُن کر سمجھا کہ وہ پاگل ہے۔ لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ اسے اُس کی داڑھی مونڈنا ہی پڑے گی۔ تو اس نے قینچی اُٹھا کر زور سے ہاتھوں میں چلائی جیسے اس کا امتحان کر رہا ہو کہ کہیں داڑھی کے بالوں میں پھنس کر ٹوٹ تو نہ جائے گی اور پھر ویرندر کی طرف جھک کر کہنے لگا ——

"آپ کیا جیل سے تشریف لائے ہیں؟"

"تمہیں اس سے کیا" ویرندر نے جھنجھلا کر کہا —— "چلو اپنا کام کرو" حجام اس کے لہجے کی تلخی سے حیران تو ہوا مگر اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کوئی مزید بات کئے بغیر اپنا کام شروع کر دے —— قینچی کے

آہنی بازو ایک مرتبہ ویریندر کی آنکھوں کے سامنے لرزے اور پھر انہوں نے اس کے بالوں کو بے رحمی سے کاٹنا شروع کر دیا ——

کرچ —— کرچ —— ویریندر کے بال کٹ رہے تھے اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے یہ آواز ایک نیا نغمہ ہے، ایک انوکھا راگ ہے، جو اس کی روح کی پیاس کو بجھا رہا ہے۔ اس کے وجود میں جس شے کی کمی واقع ہو گئی تھی، اسے پورا کر رہا ہے، اور اس کا دل ناچ اٹھا۔ ناچ، ناچ، اس نے اپنے دل سے کہا۔ اس سے بہتر خوشی کا اور کیا موقع ہوگا، کہ میں انسان بن رہا ہوں ——

× × ×

کچھ دیر بعد جب وہ حجام کی دوکان سے باہر نکلا تو وہ اپنے آپ کو بالکل نیا آدمی محسوس کر رہا تھا، ایک نیا ویریندر ہنیا رچی، جو انسان تھا، دیوتا نہیں تھا، بت نہیں تھا بلکہ ایک چلتا پھرتا اور بولتا چالتا آدمی تھا، اور اس کا ذہن انسانیت کی نئی علامتوں سے بھرپور تھا، فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اب وہ آزادانہ ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ ہر چیز پر ہنس سکتا تھا، ہر چیز سے لطف اٹھا سکتا تھا، اور جب اس کے چہرے پر وہ ناٹک کے بوجھل پردے کی سی داڑھی لٹک رہی تھی۔ اس وقت تو اسے یہ آزادی حاصل نہ تھی، اس وقت وہ کسی حسین عورت کو دیکھنے سے پہلے چاروں طرف دیکھ لیتا تھا تاکہ کوئی چلتے چلتے اس کی داڑھی پر فقرہ نہ کس دے —— اور پھر یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ اپنی داڑھی سمیت جیکلوں میں جلتا تو کمبیاں

سمجھتیں کہ وہ ایک مہاتما ہے اور وہ اپنی شوخی اور چنچل پن کو رخصت کر کے اس کے ساتھ عقیدت سے پیش آتیں اور جب وہ یہی داڑھی لئے شریفوں سے ملتا تو وہ ایک دوسرے کے کان میں کہتے، "بڑا جعلساز ہے، اس کی داڑھی کو آپ بس شرافت کا سائن بورڈ ہی سمجھئے، موقع ملے تو یہ خدا تک کو بھی دھوکا دے جائے، ہاں آپ کیا سمجھتے ہیں" اس وقت اسے ان فقروں سے کتنی تکلیف ہوتی تھی، مگر اب، اب وہ ان چیزوں سے آزاد تھا، اب اس کا چہرہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ اب اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب وہ لوگوں کی طنز سے محفوظ تھا بلکہ اگر چاہتا تو خود دوسروں کی ہنسی اڑا سکتا تھا، اس احساس نے اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا کر دی اور اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

× × ×

جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ جب وہ اس ہیئت میں اندر داخل ہوگا، تو اس کی بیوی اور بچی اسے کس نظر سے دیکھیں گی، اور اس خیال کے آتے ہی اس کے قدم دہلیز پر رک گئے، اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ایک دیوتا ہے۔ اس گھر کی چار دیواری میں اس کی سب سے بڑی پجارن رہتی ہے۔ کیا پجارن اتنی برسوں کی پوجا کا ایمان برداشت کر سکے گی، کیا وہ اسے دیکھ کر حسب معمول مسکرائے گی یا اس کے دل میں جوالا بھٹ پڑے گا، اور خیال ہی خیال میں اس نے ایک زبردست دھماکہ سنا اور کہیں سے بے شمار چیخیں بلند ہوئیں ——

"آگ ــــ آگ ـــ بچاؤ ـــــ بچاؤ"

اور خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں اس آگ کو کیسے برداشت کر سکونگا، اس نے سوچا، یہ آگ، عورت کی آنکھوں کی چتا مجھے جلا ڈالے گی، میں اس کی بھڑک کا نظارا نہ کر سکونگا، میں اس کی جلن برداشت نہ کر سکونگا، پھر ـــــ پھر کیا ہو گا ـــــ کیا ہو گا ـــــ اور اچانک اسے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی اس کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا، کیا یہ آگ ہے، کیا یہ جلتا ہوا لاوا ہے، کیا یہ عورت کی آنکھوں میں جلتی ہوئی چتا ہے، یہ کون ہے جو مجھ پہ چپکے سے حملہ کرنا چاہتا ہے، اور اس نے چاہا کہ وہ بھاگ نکلے مگر اسی لمحے اس کی بیوی نے کسی کو دہلیز میں کھڑے دیکھ کر کہا۔

"کون"

اور دیویندر کے منہ سے جلدی سے نکل گیا ـــــ

"میں ـــــ"

"تو اندر آئیے نا، وہاں کیوں کھڑے ہیں" ۔ اسکی بیوی نے جواب دیا ـــــ

اور وہ خوفزدہ، سہما ہوا، اور پریشان، جی کڑا کر کے آگے بڑھا، آگ اب اور بھی زیادہ قریب آ رہی تھی، جوالا پھٹنے والا تھا ۔ اس کا جسم اب لاوے کی جلن کو محسوس کرنے لگا تھا، وہ دروازے میں ایک لمحے کیلئے رکا ـــــ اب آگ اس کے سامنے کھڑی تھی، اب وہ اس سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا، لپکتی اور بل کھاتی ہوئی آگ، اور اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے اسے اس آگ میں

دھکیل دیا ——

"ہا" اس کی بیوی کی نگاہیں یکایک اس کی طرف اُٹھیں اور اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے، کمرے کی ہر چیز جیسے بےحس ہو گئی، منجمد ہو گئی، مر گئی، سناٹا، چاروں طرف ایک بھیانک سناٹا تیرنے لگا، اور اس سناٹے میں دیویندر کو ایک عورت کی دو آنکھوں کی موجودگی کا احساس ہوا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، دیکھے جا رہی تھیں، دو خاموش سمندر جن میں رہ رہ کر درد کی تھرتھری پیدا ہو جاتی تھی، اس کے علاوہ ان میں کچھ نہ تھا۔ نہ آگ نہ لاوا اور نہ چیتا۔ اور ان آنکھوں کی جو اس پر ہمیشہ محبت کے پھول نچھاور کیا کرتی تھیں، یہ کیفیت دیکھ کر اس کی روح میں وہ لرزش پیدا ہو گئی جس کے تصور سے بھی وہ بے حد خوفزدہ تھا۔ وہ آنکھیں جیسے اس سے پوچھ رہی تھیں، کہ تم نے یہ کیا کیا۔ وہ دیوتا کہاں ہیں جو تھوڑا عرصہ پہلے اسی مندر کے دروازے سے یہ کہکر باہر نکلے تھے کہ میں جلد ہی واپس آجاؤنگا۔ کیا وہ اب کبھی نہیں لوٹیں گے۔ بتاؤ کیا وہ کبھی واپس نہ آئیں گے" ——

دیویندر نے جیسے دل ہی دل میں کہا، تم مجھے نہیں پہچانتی، میں ہی تو تمہارا دیوتا ہوں، مگر اب میں بدل گیا ہوں۔ اب میں انسان بن گیا ہوں، کیا تم اس تبدیلی پر خوش نہیں ہو، کیا تمہیں میرے انسان بننے پر مسرت نہیں ہوئی ——

مگر نہیں اس کی بیوی کا چہرہ مغموم اور افسردہ تھا، اس کی آنکھوں میں ایک انوکھا غم جھانک رہا تھا اور وہ خاموش تھی، جیسے اس کی آواز مر چکی ہو، اس کے ہونٹ سل چکے ہوں اور اس کی زبان کچلی جا چکی ہو ——

تھوڑی دیر تک کمرے میں بھیانک سناٹے کا راج رہا ——— ویریندر اور اس کی بیوی دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ——— پھر اچانک ویریندر کی بیٹی دوسرے کمرے سے بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اپنی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی۔ "ماں ——— پتا جی ابھی تک نہیں آئے" ———

ویریندر کی بیوی نے چونک کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا گویا اس طرح وہ اس چیخ کو دبانا چاہتی ہو جو اس کی روح میں بری طرح مچل رہی تھی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ———

"وہ آ گئے بیٹی، دیکھو تمہارے سامنے تو کھڑے ہیں۔"

بچی نے مڑ کر ویریندر کی طرف دیکھا، اور ویریندر کو اس کی آنکھوں میں اتنی اجنبیت اور حیرانی نظر آئی کہ وہ اس سے زیادہ دیر آنکھیں نہ ملا سکا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس وقت جبکہ وہ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، اسے اپنی بیٹی کی مدھم آواز سنائی دی۔

"نہیں ماں، یہ میرے پتا نہیں ہیں، یہ تو کوئی اور ہی آدمی ہے۔ انہیں گئے بہت دیر ہو گئی ماں، پتا جی کب آئیں گے، پتا جی کب آئیں گے ——— "

اور اس کے دل میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ڈھول اور تاشوں کا شور ابھر آیا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی داڑھی پھانسی کے پھندے کی طرح اس کے گلے سے لپٹ گئی ہے۔ جس کے بل ہر لمحہ سخت ہو رہے ہیں ———

✕———✕———✕———✕

میری ڈائری کے چند ورق

۱۵ر جنوری ————————

رات ہو چکی ہے اور میں ساحل سمندر پر بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے بیٹھا مندرجہ ذیل سطور لکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں بھوکا بھی ہوں اور رات کو سونے کیلئے کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔ شاید کل کی طرح آج بھی انہی تاریک پتھروں پر سونا پڑے ساحل سمندر پر یہ میری تیسری رات ہے۔ ایک طرف میرین ڈرائیور کی حسین عمارتوں میں چمکتی ہوئی بتیاں ایک برقی کمان کی طرح دکھائی دے رہی ہیں اور دوسری طرف بال کیسر کی پہاڑی پر سے تاریک درختوں میں سے نیلی اور سبز روشنیاں جھانک رہی ہیں۔ سمندر جو تھوڑی دیر پہلے پرسکون تھا اب متحرک ہو گیا ہے اور پانی کی لہریں ساحل کی سنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہی ہیں۔ میرے سامنے اب بہت تھوڑے سے آدمی رہ

گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے بھی کچھ گھروں کو چلے جائیں گے اور پھر اس جگہ وہی لوگ رہ جائیں گے جو کچھ دیر بیٹھے سمندر کو گھورتے رہیں گے اور پھر چپکے سے یہیں ڈھیر ہو جائیں گے۔ تاروں بھری رات، خنک ہوا، تاریک پتھر، بھوک اور آوارہ گردی یہ میرے لئے بمبئی کے خاص تحفے ہیں۔ در اصل آوارگی کی عادت میرے لئے ہمیشہ یہی کچھ لایا کرتی ہے۔ مگر نہ جانے کیوں میرے قدم ایک جگہ نہیں ٹکتے اور ہمیشہ ایک نئی دنیا کے متلاشی رہتے ہیں۔ بمبئی بھی میرے لئے ایک نئی دنیا ہے مگر اس نئی دنیا میں بھی مناظر اور واردات کے لحاظ سے وہی اُلجھاؤ اور بےچینی موجود ہے جو اس ملک کے ہر حصّہ میں پائی جاتی ہے۔ بڑی بڑی ملوں اور کارخانوں میں منوں بوجھ سے دبے ہوئے مزدور چونے اور مٹی کی بدبودار کوٹھریوں میں افلاس اور دکھ سے کراہتے ہوئے مرد اور عورتیں، فٹ پاتھ پر سونے والے زرد رُو انسان اور سڑکوں پر احساسِ ذلت کے مارے ہوئے بھکاری ہر جگہ ایک ہی طور طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں نے اس ملک میں گھوم کر یہی دیکھا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ یہاں صرف میں ہی بھوکا نہیں بلکہ اس دیس کے کروڑوں باشندے اس صدمے کو برداشت کر رہے ہیں۔ زمین کا دل سونے کا ہے اور اس کے سینے سے لہلہاتے ہوئے سنہری خوشے پھوٹتے ہیں۔ مگر اس سرزمین کا دل شاید پتھر کا ہے کیونکہ یہاں جلے ہوئے سیاہ [illegible]وں کے علاوہ اور کچھ نہیں اُگتا۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں چرچ گیٹ سے چوپاٹی کی طرف آ رہا تھا۔ تو جو کچھ نگاہ میں آیا اس سے یہ احساس اور بھی بڑھ گیا۔ کہ اس ملک کے کسان محض چند لوگوں کے عیش کے لئے ہل چلاتے ہیں۔ زمین جب

انسانوں کا برابر کا حق ہے پھر یہ سرمائے والے کیوں پیٹ بھر کر کھاتے ہیں جبکہ کسان اور مزدور بھوکوں مرتے ہیں۔ چرچ گیٹ کے ساتھ ہی ایک عالیشان ہوٹل غرور سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے پُرتکلف کمروں میں کتنے ایسے آدمی ہونگے جن کے کارندے کسانوں کا خون سکّوں میں ڈھال کر ان کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کرتے ہوں گے اور وہ اپنی رعایا کے دلوں کی تپش اور بھوک کی تلخی سے بے نیاز شراب پینے اور ناچنے میں مشغول ہوں گے۔ انہیں کیا معلوم کہ ہوٹل کے قریب ہی کتنے لوگ ہر رات سمندر کی لہریں گنتے گنتے اپنے سروں کو بھوکے پیٹ پر جھکا کر سو جاتے ہیں اور خواب میں بھی اپنے آپ کو کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیروں پر گلی سڑی روٹیوں کے ٹکڑے چُنتے پاتے ہیں۔ جب میں اس ہوٹل کے نیچے سے گزر رہا تھا تو مجھے اپنی حالت پر اس قدر ہنسی آئی کہ میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے میں ایک آرٹسٹ ہوں اور شاید اس لئے بھوکا ہوں کہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں۔ میرا مُلک غلام ہے اور اس کی نظر میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ اپنی خاک کے تابندہ گوہر دیکھ سکے۔ مگر مجھے اس کا شکوہ کیوں۔ اگر میں انسانیت کا پروانہ ہوں تو میرا کام اپنے مقصد کے لئے قربان ہو جانا ہے۔ مجھے یہ جوہر اس لئے بخشا گیا ہے کہ میں دُنیا سے ظلم۔ محکومی۔ بھوک، خودغرضی اور ریاکاری کا خاتمہ کر دوں اور لوگوں کو بتاؤں کہ جس دُنیا میں تم رہتے ہو وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اسے جلا دو، برباد کر دو اور اس کے کھنڈروں پر ایک نئی دُنیا تعمیر کرو جہاں آزادی اور مساوات کا راج ہو اور انسانیت اپنی

بلند ترین خواہشات کی تکمیل کرے کوئی غم نہیں اگر آج میں بھوکا ہوں کوئی فکر نہیں اگر آج مجھے رہنے کے لئے ایک چھوٹی سی کٹیا بھی میسر نہیں۔ کوئی پروا نہیں اگر آج میں غلامی کا کڑا درد سہہ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس جہان کی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جس میں میرے ساتھ کروڑوں باشندوں کو بھوک اور غلامی سے نجات ملے گی۔ مجھے وہ نعرہ بلند کرنا ہے جسے سُن کر انسان کی رگ رگ سے مسرت کے نغمے پھُوٹیں گے۔ مجھے وہ گیت گانا ہے جسے سُن کر اس اُجڑے ہوئے چمن میں پھر بہار آئے گی۔ میں اسی لئے زندہ ہوں اور سکڑوں دُکھ سہہ کر بھی۔ اپنے مقصد کے لئے زندہ رہوں گا۔ اور جب میں اپنا کام ختم کر چکوں گا تو ایک راحت بھری سانس لے کر میٹھی نیند سو جاؤنگا۔

۱۳ مارچ

مُلک کا سب سے بڑا شاعر مر رہا ہے۔ وہ سخت بیمار ہے اور ناکافی علاج کے باعث وادی موت کی جانب رواں ہے لیکن اس کا احساس شاعروں اور ادیبوں کی بجائے ایکٹرسوں اور کسبیوں کو ہے۔ یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ غیر فانی محبت اور عقیدت کی چنگاریاں ان لوگوں کے سینوں میں سلگ رہی ہیں جنہیں ہم سماج کے گھناؤنے زخموں کے نام سے پکارتے ہیں اُن کا روپیہ کمانے کا طریقہ بُرا ہے لیکن اس کا مصرف کس قدر مقدس ہے ہمارے ادیب اور شاعر ایک نئی سماج کی تعمیر میں مصروف ہیں مگر انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جب ان کا ایک بہت بڑا ساتھی، نئی سماج کا معمار اعظم پنجۂ موت میں گرفتار ہے تو ان کا فرض ہے کہ اسے بچانے کیلئے

اپنی ساری قوتیں خرچ کر دیں۔ اس ملک کے شاعر و ادیب کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب معمار ہی نہ ہو گا تو عمارت کیسے بنے گی۔ وہ انقلابی شاعر جس کے زندگی بخش پیام میں شیر کی سی گرج اور نغمے کی سی حلاوت موجود ہے۔ وہ باغی پیامبر جس کی عمر ہی ایک سچے مقصد کے لئے لڑتے ہوئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے گزر گئی۔ وہ بہادر سپاہی جس نے آج تک راہِ طلب سے منہ نہیں موڑا وہ یوں سسک سسک کر دم توڑے کہ اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ نئے ہندوستان کا معمارِ اعظم اس بے جان وید ہے کہ اس کے پاس علاج کے لئے روپیہ نہ ہو۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کرتے کہ شاعر اور ادیب قوم کی جائداد ہیں۔ اگر یونہی ہے تو شاعر کی موت کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔ کاش وہ اس بدنصیب ملک میں پیدا نہ ہوتا جس کے باشندے اپنی روح کا گلا بھی اپنے ہی ہاتھوں گھونٹ دیتے ہیں۔

۲۷ر مئی

یہ میرا کمرہ ہے رات کو جب میں بتی جلا کر یہاں بیٹھتا ہوں تو میرا ذہن اس مختصر سی جگہ میں سیکڑوں جہان آباد کرتا ہے یہ کمرہ بہت چھوٹا سا ہے۔ تین تصویریں، دو کرسیاں ایک چارپائی اور فرش پر بچھی ہوئی ایک چھوٹی سی دری اس کی کل بساط ہے میں ان چیزوں سے بہت مانوس ہوں۔ دن بھر روٹی کی تلاش میں مصروف رہنے کے بعد جب رات کو یہاں پہنچتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنے دوستوں کے درمیان آ گیا ہوں دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویریں جیسے میرا چہرہ دیکھ کر مسکرانے لگتی ہیں۔ کرسیاں اپنے بازو پھیلائے

محبت کے ساتھ مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں۔ اور چارپائی کی خالی آغوش میرے جسم کو ایک راحت بھری نیند کا پیغام سناتی ہے۔ عموماً میں اسی کمرے میں سوچتا اور لکھتا ہوں اور جب میرا دماغ تھک جاتا ہے تو میں ان تصویروں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کے بیجان چہرے میری طرف ہمیشہ ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ ان تصویروں میں ایک چہرہ بوڑھا ہے مگر اس کی روشن آنکھوں میں عزم کی چمک ہے اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دوسری تصویر ایک عورت کی ہے جس کا رُواں رُواں محوِ انتظار معلوم ہوتا ہے۔ یہ میرے ایک آرٹسٹ دوست نے لندن سے بنا کر مجھے بھیجی تھی۔ اور لکھا تھا کہ اسے اپنی اس تخلیق پر بہت ناز ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا (INDIA) —— وہ انتظار کر رہی تھی۔ اس کا محبوب پردیس میں ہے اور کون جانے وہ کب لوٹ آئے۔ اے نامراد اور غم نصیب عورت کیا تو کبھی انتظار کی گھڑیوں کو ملاپ اور مسرت کے نغموں سے نہ بدل سکے گی۔

ان دونوں تصویروں کے درمیان ایک ادھیڑ عمر چہرہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نرمی اور ماتھے سے ایک سہانا نور پھوٹ رہا ہے۔ میں اسی نور کی ایک کرن ہوں۔ اسی سبز ٹہنی کا ایک پتا ہوں اور میری روح نے ابھی تک جو کچھ اس سے حاصل کیا ہے اسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میں جب بھی ان تصویروں کو دیکھتا ہوں میرے دماغ میں حقیقی زندگی کا ایک واضح تصور پیدا ہوتا ہے، عزم، جدّوجہد اور انتظار اور میں

سمجھتا ہوں کہ ایک سچے مقصد کی لڑائی کے ساتھ مجھے وقت کا انتظار بھی ہے۔ اس وقت کا انتظار جب شمال سے سُرخ آندھی اُٹھے گی اور ان تمام درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے گی جن کے نیچے غلامی، بھوک اور موت کے بھوت دانت نکالے بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد اس دھرتی کا نکھار دیکھنے کے قابل ہو گا۔ ہر طرف نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ نئے پھول مسکرائیں گے۔ اور وُہ منظر کتنا دلآویز ہو گا جب انسان زندگی کو پہلی بار محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اور جھوم کر ایک ایسا ترانہ چھیڑے گا کہ خدا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ جائے گی۔

۸ر اگست

غم نصیب دل کیا تجھے کبھی قرار نہ آئے گا۔ آخر تیری خطا کیا ہے جو تجھے اتنی کڑی سزا دی گئی ہے۔ کیا تو انسان سے ہمدردی رکھنے کا مجرم ہے۔ اسی لیئے تو تو یہ جانگداز صدمے سہہ رہا ہے دیکھ تو سہی دُنیا کتنے بھیانک طریقے سے برباد ہو رہی ہے۔ آج کا انسان اس انسان سے کتنا مختلف ہے جس نے جب پہلی بار اس دھرتی پر قدم رکھا تھا تو اس کا دل محبت اور مسرت سے بھرپور تھا۔ اس وقت زمین کی ہر چیز اس کی اپنی تھی۔ قدرت کے خزانے اس کے لئے کھلے پڑے تھے وہ ضرورت کے مطابق ہر چیز لے لیا کرتا تھا۔ مگر آج حالات کتنے بدل چکے ہیں۔ انسان اب غاصب، ڈاکو اور وحشی بن چکا ہے۔ اس کے دل سے محبت کے موتی لُٹ چکے ہیں اب وہ بالکل خالی ہے اور اس میں

ویرانی کا راج ہے۔ زمین پر غاصبوں کا قبضہ ہے اور وہ اسے اچھی طرح برباد کر رہے ہیں انسان انسان سے نفرت کرتا ہے اور اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے۔ دھرتی اپنے بازو پھیلائے چپ چاپ لیٹی ہے اور اس کی چھاتی پر اس کے بیٹے خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہم سب ایک ہیں اور اس وحشیانہ جنگ میں اپنا گلا اپنے ہی ہاتھوں گھونٹ رہے ہیں۔ دنیا اب بہت تاریک ہو چکی ہے ساری روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ اندھیرے میں مظلوم انسانیت کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔ اب تو فریاد کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ یہ کس قدر اندوہناک حقیقت ہے کہ انسان جس کی تخلیق پر خدا مسکرایا تھا خود بخود برباد ہو رہا ہے۔ خدا کی تخلیق موت کے گھاٹ اتر رہی ہے اور وہ اسے سنبھال نہیں سکتا۔ تو اسے نہیں دیکھ سکتا اور خون کے آنسو رو رہا ہے۔ زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جب تجھے قرار میسر ہو تو روتا ہے فریاد کرتا ہے اور اس سارے تماشے کو بند کر دینے کا منصوبہ باندھنے لگتا ہے۔ کیا وقت آئے گا جب تیری آرزوئیں پوری ہونگی اور زمین سکھ اور چین کا سانس لے گی۔ جب تمام انسان محبت بھرے دلوں سے ایک دوسرے سے ملیں گے۔ جب ظلم اور جبر کے دیوتا خودکشی کریں گے اور ان کی جگہ آزادی اور مساوات کے پرچم بلند ہونگے جب مظلوم انسانیت کی بیڑیاں کٹیں گی اور ہر جاندار مخلوق آزاد ہوگی۔ جب تک یہ نہ ہوگا تو بے قرار رہیگا۔

تو بدستور اپنی آگ میں جلتا رہے گا۔

اور جب خاک کے نیچے تو آرام کرے گا اس کے ذرّے ذرّے سے محبت کی آتشیں چنگاریاں پھوٹتی رہیں گی ——— !!

تمام شُد


فکر و نظر
شبلی۔ بی کام
فکر و نظر
شبلی بی کام
۲/-/-
عالمگیر بکڈپو لاہور